بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تزکِ اُردو

TO

THOMAS ROWLAND WYER, ESQ., B. A. I F.

Officiating Commissioner, Rohilkhand Division,

Formerly Magistrate & Collector, Meerut,

who has given an impetus to HIGH EDUCATION in the Meerut Division by founding a College at its head quarters

AND

WHO HAS ORGANIZED, EXPANDED AND IMPROVED

THE MIDDLE AND PRIMARY EDUCATION

IN

Some of the Districts of the Division,

THIS BOOK IS INSCRIBED

AS A MARK OF ADMIRATION FOR HIS INDEFATIGABLE LABOURS AND VAST SYMPATHY FOR THE NATIVES.

BY

THE COMPILER.

Meerut, May, 1898.

انتخاباتِ زبانِ اردو

الموسوم بہ

تُزکِ اردو

از

محمد اسمٰعیل مصنف آثار سلف وریزہ جواہر وسلسلۂ کتب
زبان اردو وسلسلۂ قواعد اردو وغیرہ وغیرہ
مدرس گورنمنٹ سینٹرل نارمل اسکول
آگرہ

سنہ ۱۸۹۹ع

مطبع اکبری آگرہ

بار دوم

دیباچہ

زبانِ اُردو کی کم مایگی مسلم ہی سہی۔ تو بھی یہ عذر انتخاب کی ذمہ داریوں سے ہم کو چنداں سبکدوش نہیں کرتا۔ جو سبق طلبہ کے درس و مطالعہ کے لئے پیش کئے جائیں۔ وہ بالضرور فصاحت و بلاغت میں کامل عیار۔ ادب و اخلاق کی میزان میں سنجیدہ۔ دلاویزی و شگفتگی کے آب و نمک سے بامزہ ہونے چاہئیں +

کامیابی کا دعویٰ تو نہیں مگر ہم نے حتی الامکان کوشش کی ہے۔ کہ مضامین منتخبہ میں حسن ظاہر کے ساتھ معنوی پاکیزگی بھی ضرور ہو۔ زباندانی بیشک ایک جوہر ہے۔ مگر جب زبان سے قوائے روحانی مضمحل ہو جائیں۔ اُس سے تو بے زبانی ہی بمراتب بہتر ہے +

نثر اُردو نے نظم سے بہت پیچھے رواج پایا ہے۔ اُس کی ابتدا قصہ کہانیوں سے ہوئی اور تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا۔ کہ تصنع اور تکلف نے اُس کو بیکار محض کر دیا۔ مگر میرزا غالب مرحوم کی تحریرات سادہ و سرسری نے اُس کا قدرتی حسن دکھایا۔ پھر سرسید مرحوم اور اُن کے مقلدین نے مغربی خیالات کی جان ڈالکر اُس میں مہذب زبانوں کی سی آن و ادا پیدا کردی۔ اگرچہ قابلِ انتخاب قریب تر زمانہ کی نثر ہے۔ مگر ہم نے مشاہیر قدیم و جدید سب کے کلام کا نمونہ لیا ہے۔ تاکہ طلبہ کو مختلف اسالیب بیان سے واقفیت حاصل ہو +

اصنافِ نظم میں تو ہمارے شعرائے سخن سنج نے شیوا بیانی اور آتش زبانی کی دھوم مدت سے مچا رکھی ہے اور ریختہ کو رشکِ پارسی بنانے میں کسر نہیں چھوڑی۔ لیکن اس سیمیائی باغ میں سے ایسے گل پھول چُننا۔ جو نوخیز طبائع کو آشفتہ اور جذبات نفسانی کے بھوت کو بیدار نہ کردیں۔ سخت مشکل کام ہے۔ ہارے ہم نے اس طلسم کدہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھا اور اساتذۂ ماضی و حال کے پاکیزہ کلام سے اس مجموعہ کو زیب و زینت دی۔ امید ہے کہ اس انتخاب کے مطالعہ سے مہارت زباندانی کے علاوہ طلبہ کو یہ بھی معلوم ہوگا۔ کہ اُردو کی نظم و نثر نے ایک صدی سے زیادہ عرصہ میں کیا کیا منزلیں اپنی ترقی کی طے کی ہیں + مارچ ۱۸۹۸ء

محمد اسمٰعیل

فہرست مضامین توزک اُردو

حصۂ نثر

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	سولزیشن۔ از سر سید احمد خان مرحوم	۱
۲	عزت 〃 〃 〃	۷
۳	موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ۔ از نواب محسن الملک سید مہدی علی خان	۹
۴	زبانِ گویا۔ از خواجہ الطاف حسین حالی	۱۷
۵	حیات سعدی 〃 〃 〃	۲۱
۶	ریاضت جسمانی۔ از شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب	۲۹
۷	عقل کی نارسائی 〃 〃 〃 〃 〃	۳۵
۸	کارخانۂ قدرت 〃 〃 〃 〃 〃	۳۹
۹	قسطنطنیہ کے مختصر حالات۔ از شمس العلما مولانا شبلی نعمانی	۴۵
۱۰	مصر کی قدیم یادگاریں 〃 〃 〃	۵۱
۱۱	بزمِ قدرت۔ از مولوی عبد الحلیم شرر	۵۴
۱۲	وارن ہیسٹنگز کے اخلاق و عادات۔ از شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ	۵۷
۱۳	ادب 〃 〃 〃	۶۱
۱۴	حیا 〃 〃 〃	۶۲
۱۵	محنت 〃 〃 〃	۶۴
۱۶	اُردو و انگریزی انشا پردازی پر کچھ خیالات۔ از شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد	۶۶
۱۷	تذکرۂ ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق 〃 〃 〃 〃	۷۲
۱۸	خط ۱-۱۱۔ میرزا اسد اللہ خان غالب	۸۰
۱۹	جنگ مرہٹہ۔ از مؤلف	۸۸
۲۰	جاڑے کی شدت۔ از میرزا رجب علی بیگ سرور ..	۹۵
۲۱	قصہ۔ از میر امن دہلوی	۹۸

حصۂ نظم

مثنویات	
حُبِّ وطن - از خواجہ الطاف حسین حالی	۱
برکھا رُت 〃 〃 〃	۵
از مثنوی میر حسن دہلوی ..	۶
از مثنوی گلزار نسیم	۱۴
از مثنوی میر تقی	۲۰
غزلیات	
فصیح الملک نواب میرزا خان داغ دہلوی	۲۲
امیر الشعرا منشی امیر احمد امیر مینائی	۲۵
از مؤلف	۲۷
سراج الدین محمد - بہادر شاہ - ظفر	۳۰
شیخ ابراہیم ذوق	۳۳
حکیم مومن خان مومن ..	۳۶
نواب مصطفےٰ خان شیفتہ ..	۳۹
میرزا اسد اللہ خان غالب ..	۴۲
خواجہ حیدر علی آتش ..	۴۵
شیخ امام بخش ناسخ ..	۴۸
شیخ قلندر بخش جرأت ..	
سید انشاء اللہ خان - انشا ..	۵۲
شیخ غلام ہمدانی - مصحفی ..	۵۵
میر محمد تقی - میر	۵۸
میرزا رفیع سودا	۶۱
خواجہ میر درد	۶۴
قصائد	
امیر الشعرا منشی امیر احمد امیر مینائی	۶۶
شمس العلما مولوی سید نذیر احمد	۶۹
حکیم مومن خان مومن ..	۷۰
میرزا اسد اللہ خان غالب ..	۷۲
شیخ ابراہیم ذوق	۷۳
خواجہ الطاف حسین حالی ..	۷۶
قطعات	۷۸
مسدسات	۸۲
مثمن - کیفیت قلعہ آگرہ	۸۹
رباعیات	۹۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصۂ نثر

آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خان کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل۔ ایل ڈی

ولادت ۱۷۔ اکتوبر ۱۸۱۷ء۔ وفات ۲۷۔ مارچ ۱۸۹۸ء۔ سر سید نے علی گڈھ میں مدرسۃ العلوم مسلمانان کی بنیاد ڈالی۔ اخبار انسٹیٹیوٹ گزٹ اور رسالۂ تہذیب الاخلاق دونوں اُن کی اڈیٹری میں نکلتے تھے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور تفسیر القرآن ہے چھ جلدوں میں۔ اُن کا طرز تحریر سادگی و روانی و دلنشینی میں مشہور ہے۔ تکلف نام کو نہ تھا۔ مشکل سے مشکل مضمون کو اس خوبی سے بیان کرتے کہ گویا پانی کرکے بہا دیتے تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو زبان کے علم ادب میں جو انقلاب پیدا ہوا اور انگریزی لٹریچر کا پرتو اُس پر پڑا۔ وہ زیادہ تر سر سید ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اُن کو جدید علم ادب کا بانی کہہ سکتے ہیں +

سولزیشن یا تہذیب

(از تہذیب الاخلاق)

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں۔ کہ سولزیشن کیا چیز ہے۔ اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے؟ جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے۔ یا ایسی چیز ہے۔ کہ اُس کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اُس کا تعلق ہے وہ قانون قدرت میں پایا جاتا ہے۔ اِس

امر کے تصفیہ کے لئے ہم کو انسانی حالات پر نظر کرنی چاہئے۔ اگر تہذیب اِنسان میں ایک فطری چیز ہے۔ تو وحشیوں میں۔ شہریوں میں۔ سب میں اُس کا نشان ملیگا۔ گو اُس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں۔ اِلّا سب کی جڑ ایک ہی ہوگی +

انسان میں یہ ایک فطری بات ہے۔ کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند۔ یا یوں کہو۔ کہ کسی چیز کو اچھّا ٹھیراتا ہے اور کسی کو بُرا۔ اور اُس کی طبیعت اِس طرف مائل ہے۔ کہ اُس بُری چیز کی حالت کو۔ ایسی حالت سے تبدیل کرلے۔ جس کو وہ اچھّا سمجھتا ہے۔ یہ ہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے۔ جو انسان کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ اِسی تبادلہ کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے اور کچھ شبہ نہیں۔ کہ یہ مَیلان یا یہ خواہش مبادلہ انسان میں قدرتی ہے +

سولزیشن یا تہذیب کی طرف اِنسان کی طبیعت کے مائل ہونے کے دو اُصول ٹھیرے۔ اچھّا اور بُرا۔ اور بُرے کو اچھّا کرنا سولزیشن یا تہذیب ٹھیری۔ مگر اچھّا اور بُرا قرار دینے کے مختلف اسباب خِلقی اور خُلقی۔ مُلکی اور تمدّنی ایسے ہوتے ہیں۔ جن کے سبب اچھّا اور بُرا ٹھیراتے ہیں۔ یا یوں کہو۔ کہ قوموں کی سولزیشن میں اِختلاف پڑجاتا ہے۔ ایک قوم جس بات کو اچھّا سمجھتی ہے اور داخلِ تہذیب جانتی ہے۔ دوسری قوم اُسی بات کو بہت بُرا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے۔ یہ اِختلاف

سِولزیشن کا قوموں کے باہم ہوتا ہے۔اشخاص میں نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے +

جب کہ ایک گروہ اِنسانوں کا کسی جگہ اکھٹّا ہوکر بستا ہے۔ تو اکثر اُن کی ضرورتیں اور اُن کی حاجتیں۔اُن کی غذائیں اور اُن کی پوشاکیں۔اُن کی معلومات اور اُن کے خیالات۔اُن کی مسرّت کی باتیں اور اُن کی نفرت کی چیزیں۔سب یکساں ہوتی ہیں۔اور اِسی لئے بُرائی اور اچّھائی کے خیالات بھی سب میں یکساں پیدا ہوتے ہیں۔اور بُرائی کو اچّھائی سے تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے۔ اور یہ ہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اُس قوم یا گروہ کی سِولزیشن ہے۔مگر جب کہ مختلف گروہ مختلف مقامات میں بستے ہیں۔تو اُن کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔اور اِس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔مگر ضرور کوئی ایسی چیز بھی ہوگی۔کہ جو سِولزیشن کی اُن مُختلف حالتوں کا تصفیہ کرسکے +

ملکی حالتیں جہاں تک کہ وہ بود و باش سے تعلق رکھتی ہیں۔ نہ فکر و خیال و دماغ سے۔اُن کو تہذیب سے چنداں تعلّق نہیں بلکہ صرف انسان کے خیال کو اُس سے تعلق ہے۔جس کے سبب وہ اچھا اور بُرا ٹھیراتا ہے۔اور جس کے باعث سے خواہش تبادلہ تحریک میں آتی ہے۔اور وہ تبادلہ واقع ہوتا ہے۔جو سِولزیشن کہلاتا ہے۔پس سِولزیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کرسکتے ہیں۔جن کے سبب سے

اچھے اور بُرے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے +

خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرت معلومات اور علم طبعیات سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو روز بروز ترقّی ہوتی جاتی ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے۔ کیا عجب ہے ؟ کہ آیندہ کوئ ایسا زمانہ آئے۔ کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو۔ کہ اِس زمانہ کی تہذیب کو بھی۔ لوگ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں۔ جیسے کہ ہم اپنوں سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مودّب دل سے دیکھتے ہیں +

تہذیب یا یوں کہو۔ کہ بُری حالت سے اچھّی حالت میں لانا دنیا کی تمام چیزوں سے اخلاقی ہوں یا مادّی یکساں تعلّق رکھتا ہے۔ اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کرنے کا سب کو یکساں خیال ہے۔ ہنر اور اُس کو ترقّی دینا تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم زر و جواہر۔ یاقوت و الماس سے نہایت نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے۔ ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پوتھوں سے اپنی آرائش کا سامان بہم پُہنچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرائش میں۔ سونے چاندی مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں۔ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت اور رنگین پَروں کو تیلیوں پر سے چھلے ہوئے سُنہری پوست اور زمرّد کے سے رنگ کی باریک اور خوشنما گھاس میں گوندھکر اپنے تئیں آراستہ

کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے۔ ناتربیت یافتہ بھی اُس کی درستی پر مصروف ہیں۔ شاہی مکانات نہایت عمدہ اور عالی شان بنتے ہیں اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ناتربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور اُن کے رہنے کے گھونپے درختوں پر باندھے ہوئے ٹانڈ۔ زمین میں کھودی ہوئی کھوئیں بھی تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزیں۔ تمدّن کے قاعدے۔ عیش و عشرت کی مجلسیں۔ خاطر و مدارات کے کام اخلاق و محبت کی علامتیں دونوں میں پائی جاتی ہیں ٭

علمی خیالات سے بھی ناتربیت یافتہ قومیں خالی نہیں۔ بلکہ بعض چیزیں اُن میں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً شاعری جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے۔ ناتربیت یافتہ قوموں میں عجیب عمدگی و خوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے۔ وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔ موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے۔ مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے۔ اُن کی ادا اور آواز کی پھرت۔ اُس کا گھٹاؤ اور اُس کا بڑھاؤ۔ اُس کا ٹھیراؤ اور اُس کی اُپج۔ ہاتھوں کا بھاؤ اور پانوں کی دھمک زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے۔ مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں یہ سب چیزیں دلی جوش کی موجیں ہیں۔ وہ لَے اور تال اور راگ راگنی کو نہیں جانتے۔

مگر دل کی لہر اُن کی لے۔ اور دل کی پھڑک اُن کا تال ہے۔ اُن کا غول باندھکر کھڑا ہونا۔ طبعی حرکت کے ساتھ اُچھلنا۔ دل کی بے تابی سے جُھکنا اور پھر جوش میں آکر سیدھا ہو جانا۔ گو نزاکت اور فن غُنیا گری سے خالی ہو۔ مگر قدرتی جذبوں کی ضرور تصویر ہے۔ دلی جذبوں کا روکنا اور اُن کو عمدہ حالت میں رکھنا تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے۔ پس جس طرح ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں۔ اِسی طرح اُس کا تعلّق عقلی اور مادّی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں۔ جس چیز میں ترقی یعنی بُرائی سے اچھائی کی طرف رجوع یا ادنےٰ سے اعلےٰ درجہ کی طرف تحریک ہوسکتی ہے۔ اُسی سے تہذیب بھی متعلق ہے +

پس سِولزیشن یا تہذیب کیا ہے؟ اِنسان کے افعال اِرادی اور جذبات نفسانی کو اعتدال پر رکھنا۔ وقت کو عزیز سمجھنا۔ واقعات کے اسباب کو ڈھونڈنا۔ اور اُن کو ایک سلسلہ میں لانا۔ اخلاق۔ معاملات معاشرت۔ طریق تمدّن اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطری عمدگی پر پہنچانا۔ اور اُن سب کو خوش اسلوبی سے برتنا + اِس کا نتیجہ کیا ہے؟ روحانی خوشی۔ جسمانی خوبی۔ اصلی تمکین۔ حقیقی وقار۔ اور خود اپنی عزّت کی عزّت۔ اور در حقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے۔ جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے +

(سید احمد خان)

عزّت

(از تہذیب الاخلاق)

بہت کم لوگ ہیں۔جو اُس کی حقیقت جانتے ہوں۔اور بہت کم ہیں۔جو اُس کے مشتقات کے معزّز القابوں کے مستحق ہوں۔جس کی لوگ بہت آؤ بھگت کرتے ہیں۔اُسی کو لوگ معزّز سمجھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو بھی معزّز جانتا ہے۔اوصاف ظاہری بھی ایک ذریعہ معزّز ہونے اور معزّز بننے کا ہے۔جو دولت۔حکومت اور حشمت سے بھی زیادہ معزّز بنا دیتا ہے۔مگر یہ اعزاز اس سے زیادہ کچھ رُتبہ نہیں رکھتا۔جیسا کہ ایک تانبے کی مورت پر سونے کا ملمّع کردیا گیا ہو۔جب تک وہ مورت ٹھوس سونے کی نہ ہو۔اُس وقت تک درحقیقت وہ کچھ قدر و قیمت کے لائق نہیں ہے۔یہی حال انسان کا ہے:۔جب تک اُس کی حالت بھی عزّت کے قابل نہ ہو۔وہ معزّز نہیں ہوسکتا۔

لوگوں کو کسی اِنسان کی اندرونی حالت کا جاننا نہایت مشکل بلکہ قریب ناممکن کے ہے۔پس اُن کا کسی کو معزّز سمجھنا درحقیقت اُس کے معزّز ہونے کی کافی دلیل نہیں ہے۔ہاں وہ شخص بلا شبہ معزّز ہے۔جس کا دل اُس کو معزّز جانتا اور معزّز سمجھتا ہو۔جس کو انگریزی میں سیلف رسپیکٹ کہتے ہیں۔کوئی شخص کسی سے جھوٹی بات کو سچّی بناکر کہتا ہے۔تو خود اُس کا دل اُس کو ٹوکتا ہے۔کہ یہ سچ نہیں ہے۔گو سُننے والا اُس کو سچ سمجھتا ہو۔مگر کہنے والے کا دل گواہی دیتا ہے۔

کہ وہ جھوٹوں میں کا ایک جھوٹا اور بےعزّتوں میں کا ایک بے عزّت ہے +
اِسی طرح تمام افعال انسان کے۔ جو صرف ظاہری نمائش کے طور پر کئے جاتے ہیں۔ گو لوگ اُن کی عزّت کرتے ہوں۔ مگر درحقیقت وہ عزّت کے مستحق نہیں ہیں۔ عزّت کے لائق وہی کام ہیں۔ جن کو دل بھی قابلِ عزّت سمجھے۔ اِس لئے انسان کو انسان بننے کے لئے۔ ضرور ہے۔ کہ تمام اُس کے کام سچّائی اور دلی شہادت پر مبنی ہوں۔ ہم کوئی بات ایسی نہ کہیں۔ جس کو ہمارا دل جھُٹلاتا ہو۔ ہم کوئی کام ایسا نہ کریں۔ جس کی عزّت ہمارا دل نہ کرتا ہو۔ کسی سے ہم اظہار دوستی اور محبّت کا نہ کریں۔ اگر درحقیقت ہمارے دل میں۔ اُس سے ویسی ہی محبّت اور دوستی نہ ہو۔ جیسی کہ اظہار کرتے ہیں۔ ہم کوئی کام ایسا نہ کریں۔ جس کو ہمارا دل اچّھا نہ سمجھتا ہو +

"صلحِ کُل ہونا" اگر اِس کے معنی یہ ہوں۔ کہ سب سے اِس طرح ملیں۔ کہ ہر شخص جانے۔ ہمارے بڑے دوست ہیں۔ تو یہ تو نفاقِ اکبر ہے۔ ایسا شخص نہ کسی کا دوست ہوتا ہے اور نہ کوئی اُس کا دوست ہوتا ہے۔ اور اگر اُس کے یہ معنی ہوں۔ کہ کسی سے بغض۔ عداوت اور دشمنی اپنے دل میں نہ رکھّے۔ کسی کا بُرا نہ چاہے۔ دشمن کی بھی بُرائی نہ چاہے۔ وہ بلاشبہ تعریف کے قابل ہے۔ دل انسان کا ایک ہے۔ اُس میں دو چیزیں یعنی عداوت (کسی کے ساتھ کیوں نہ ہو) اور محبّت سما نہیں سکتی۔ وہ ایسی کُلھیا نہیں ہے۔ جس میں دو خانے ہوں۔ ایک

محبّت کا۔ ایک عداوت کا۔ اور اِس لئے یہ دو چیزیں گو اشخاصِ متعدّد اور حیثیاتِ مختلفہ کے ساتھ کیوں نہ ہوں۔ دل میں سما نہیں سکتیں۔ اِس لئے انسان کو لازم ہے۔ کہ محبّت کے سوا کسی دوسری چیز کے لانے کا دل میں خیال ہی نہ کرے۔ اور ایسی ہی زندگی اِنسان کے لئے عمدہ زندگی ہے +

نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں منیر نواز جنگ

(از تہذیب الاخلاق)

موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ

ایک روز خیال نے مجھے عالمِ مثال تک پہنچایا۔ اور اُس طلسم کدہ کو جہاں سب چیزوں کی شبیہ اور تمام حالتوں کی تصویر مُصوّرِ قدرت نے کھینچ رکھی ہے۔ دکھایا۔ در حقیقت میں نے اُسے ویسا ہی پایا۔ جیساکہ سُنا کرتا تھا۔ بلا شبہ وہ ہماری حالتوں کا آئینہ اور ہمارے خیالوں کی تصویر کا مرقع ہے +

جب میں اُس طلسم خانہ کی مغربی جانب پہنچا۔ تو ایک چار دیواری دیکھی۔ جو میرے خیال سے بھی زیادہ بلند اور میرے حوصلہ سے بھی زیادہ وسیع اور میری ہمّت سے بھی زیادہ مضبوط تھی۔ قدرت نے ایسا سُنہرا رنگ دیا تھا۔ کہ جب سورج کی کرن اُس پر پڑتی۔ تو وہ دیوارِ زرنگار کندن کی طرح چمکتی۔ جس سے آنکھوں کو چکا چوند ہوجاتی۔ اُس دیوار

کے چاروں طرف پھرا۔ پر میں نے دروازہ نہ پایا۔ مگر ایک جگہ ایک بڑی نہر دیکھی۔ جو دیوار کے نیچے سے اندر جاتی ہے۔ اور ایک بلندی پر چشمہ دیکھا۔ جس سے نہر میں پانی گرتا ہے +

میں نے وہاں ایک رفیق پایا۔ جس کا نام خرد تھا۔ اُس سے حقیقت اُس کی پوچھی۔ تو اُس نے کہا۔ کہ اِس کے اندر ایک ایسا پُرفضا باغ ہے۔ جسے جنّت عدن بھی دیکھے۔ تو شرمندہ ہو۔ اور یہ نہر اُسی کے شاداب کرنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ تب تو مجھے جانے کا شوق ہوا۔ اپنے رہنما سے دروازہ کا نشان پوچھا۔ اور میں نے اُس کی کامل اطاعت اور بڑی تابعداری کی۔ تب اُس نے پانچ برس کے بعد دروازہ بتایا۔ مَیں اُس دروازہ کی محراب کی بلندی اور اُس کے طاق اور کنگرہ کی خوبی کیا بیان کروں! میں جاتے ہی بے تابانہ دوڑنے لگا۔ اور باغ کی سیر سے سیر ہونا چاہا۔ میری اِس بو الہوسی پر میرا رہنما ہنسا۔ اور کہا۔ کہ اے نادان! دروازہ تو پانچ برس کی محنت کے بعد پایا۔ اِس باغ کی سیر کیا آسان ہے! جس کا ایک کنارہ ازل اور دوسری حد لحد ہے +

خیر! میں نے ہوس کو روکا۔ اور خرد نے جس چال چلایا چلا۔ کئی برس کے بعد چند کیاریاں اُس باغ کی دیکھ پائیں۔ مگر اُن کی خوبی اور لطافت میرے بیان سے باہر ہے۔ ہر چمن قدرت کا کارخانہ اور صنعت کا تماشا تھا۔ اُس باغ کے سبزہ کا مستانہ جھومنا۔ قمری کی آواز۔ بلبلوں کا پھولوں پر گرنا۔ پھولوں کا کھِلنا۔ کلیوں کا چٹکنا۔ نرگس کی نظر بازی

اور شمشاد کی سرو قدی نے مجھے ایسا مست کر دیا۔ کہ اپنے ہوش و حواس میں نہ رہا +

مَیں چندے اُس باغ میں رہا۔ پر مجھ کو اپنی صورت کا کوئی رفیق نہ ملا۔ جس سے دل بہلاتا۔ اور اُس باغ کی بہار لوٹتا۔ آخر اپنی تنہائی سے گھبرایا اور باہر نکلا۔ کہ کوئی مجھ سا ملے۔ تو یہاں لاؤں اور اپنا دل خوش کروں +

میں اُس باغ سے نکل کر برسوں اسی تلاش میں پھرا۔ لیکن کوئی نہ ملا۔ آخر بعد چند سال کے مشرق کی طرف مجھے ایک چار دیواری نظر پڑی۔ جس کی صورت بھی ویسی ہی تھی۔ نہر بھی ویسی ہی اور چشمہ بھی ویسا ہی تھا جہاں سے میں نکلا تھا۔ مگر دروازہ کھُلا ہوا۔ دیوار شکستہ۔ اور کچھ نئے قسم کے آدمی آتے جاتے نظر آئے۔ میں نے اپنے رہنما سے پوچھا۔ کہ یہ تو وہی باغ ہے۔ مگر کیا سبب ہے کہ نہ دیوار کی وہ خوبی و خوش نمائی ہے۔ نہ دروازہ کی وہ رفعت و شان۔ چشمہ بھی میلا نظر آتا ہے۔ پانی کی بھی صورت بدلی ہوئی ہے۔ اُس نے کہا۔ کہ یہ وہ باغ نہیں۔ دوسرا ہے۔ پہلے اُسی باغ کی طرح آراستہ تھا۔ خزاں کی ہوا نے اس کو سُکھا دیا۔ اور زمانہ کے انقلاب نے پامال کر دیا +

جب میں باغ کے اندر گیا۔ تو چمن کے نشان کچھ نظر آئے۔ مگر نہ وہ صفائی۔ نہ وہ خوبی۔ نہریں بھی کچھ بہتی معلوم ہوئیں۔ مگر نہ پانی کی وہ لطافت۔ نہ وہ شیرینی۔ پھول جتنے تھے۔ سب کمُلائے ہوئے۔ میوے جس قدر

تھے۔ وہ سوکھے پڑے ہوئے۔ سبزہ کے زمردیں رنگ پر سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ گلوں کی سُرخی پر زردی آگئی تھی۔ نسیم کے بدلے صرصر کی تندی پریشان کرتی تھی۔ بلبلوں کی جگہ زاغ و زغن کا شور ہو رہا تھا۔ نرگس اپنی پھوٹی آنکھ سے حیرت کی نگاہ کر رہی تھی۔ حوض کی آنکھ اپنی خُشکی پر رو رہی تھی +

مَیں باغ میں پھرتے پھرتے نہر کے کنارے پُہنچا۔ تو کیا دیکھتا ہوں! کہ چند خوبصورت ماہرو نوجوان آئے۔ اور اُس نہر میں پانی پینے اور غوطہ لگانے لگے۔ جب وہ نہا دھوکر اُس سے نکلے۔ تو اُن کے چہرے بدلے ہوئے نظر آئے۔ نہ وہ شکل و شمائل تھی۔ نہ وہ نزاکت و نرمی۔ اور ہر ایک کے دو دو سینگ نکل آئے تھے۔ وہ نہر سے نکلتے ہی ایک دوسرے پر حملہ کرنے اور سینگ سے سینگ لڑانے لگے۔ یہاں تک لڑے۔ کہ کسی کا سینگ ٹوٹا۔ کسی کا چہرہ بگڑا۔ کسی کا غصّہ سے چہرہ لال ہوا۔ کسی کا کف مُنہ سے اُڑکر مجھ تک پُہنچا۔ کسی کی گردن کی رگیں مارے غصّہ کے تن گئیں۔ کسی کے مُنہ سے آواز غضب کے سبب سے نہ نکلی۔ اِسی طرح وہ وحشیانہ لڑائی لڑتے ہوئے ایک عالی شان مکان کی طرف چلے۔ میں بھی ساتھ ساتھ ہولیا۔ کہ دیکھوں۔ کیا ہوتا ہے؟ وہاں کیا دیکھتا ہوں! کہ ایک نصف وحشی نصف انسان جس کا چہرہ آدمی کا۔ دُم طاؤس کی۔ مُنہ چڑیا کا۔ پیٹ بیل کا۔ چال لومڑی کی ایک رنگین سمور کی کھال اوڑھے ہوئے کبوتر کی طرح غٹرغوں کر رہا ہے۔ جب وہ سب نوجوان

اُس کے پاس پہنچے۔ تو اُس کے آگے گر پڑے۔ اُس نے ایک کریہہ ہولناک آواز سے اُن کو پکارا۔ اور آپس کے جھگڑے کا حال پوچھا۔ اُن لوگوں نے کچھ ایسی بولی میں اُسے جواب دیا۔ کہ میں نہ سمجھا۔ مگر یہ دیکھا۔ کہ اُس وحشی آدمی نے کچھ خوش ہو کر کسی کا مُنہ چوما۔ کسی کو پیار کیا۔ اور کسی کو "مرحبا" کہا +

میں اس معاملہ کو دیکھکر حیران ہوا۔ اور پناہ مانگتا باہر نکلا اور اپنے رہنما سے اس اسرار کی خبر پوچھی۔ اُس نے کہا۔ کہ اِس نہر کے پانی کی ایسی ہی تاثیر ہے۔ کہ سب ایسی شکل کے ہوجاتے ہیں۔ جیساکہ وہ نصف وحشی نصف انسان تم نے دیکھا ہے۔ یہ نوجوان۔ نازک۔ ماہرو لڑکے بھی۔ جب زیادہ پانی پئیں گے۔ خوب غوطے نہر میں لگائیں گے۔ تو ایسے ہی ہوجائینگے۔ اور جو کچھ لڑائی تم نے دیکھی۔ یہ لڑائی نہ تھی۔ بلکہ اِن کا علمی مباحثہ تھا۔ جس کے لفظ بھی تمھاری سمجھ میں نہ آئے +

جب میں نے اِس تاثیر کا سبب پوچھا۔ تو رہنما مجھے چشمے کے کنارے پر لے گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں! کہ چشمے کے دہانہ پر دو چشمے آکر ملے ہیں۔ ایک تو سیدھا چلا گیا ہے۔ جوکہ نہایت صاف۔ پاک اور خوش گوار ہے۔ دوسرا خم و پیچ سے گیا ہے۔ جس میں جابجا نالے ندیاں ملتی گئی ہیں۔ جوکہ سب کثیف میلی اور ناپاک ہیں۔ مگر پہلے چشمے کے دہانہ پر ایک پتھر کی چٹان آگئی ہے۔ جس سے صاف پانی نہیں آسکتا۔ مگر دوسرا چشمہ کھُلا ہوا ہے۔ اُسی کا میلا بدبو دار زہریلا پانی گرتا ہے۔ اور وہی بلغ

میں جاتا ہے۔ جس کی تاثیر سے آدمی مسخ ہو جاتے ہیں +

جب میں نے اُن چشموں کا حال پوچھا۔ تو خرد نے **تحقیق** نامی رفیق کو میرے ساتھ کردیا۔ اُس کے ساتھ میں اُن دونوں چشموں کی حقیقت دریافت کرنے کو چلا۔ مدّت بعد سب حال دریافت کرکے اِس فکر میں پڑا۔ کہ اُس پتھر کی چٹان کا حال کسی سے پوچھوں۔ تب **تاریخ** نامی ایک روشن ضمیر ملا۔ اُس نے کہا۔ کہ ہزار برس ہوتے ہیں۔ تب میں اِس باغ میں آیا تھا۔ نہایت تر و تازہ۔ سبز و شاداب تھا۔ جیسا وہ باغ جو تم نے اوّل دیکھا ہے۔ اِس باغ کی نہروں میں صاف چشمہ کا پانی آتا تھا۔ اور گدلے چشمہ پر پتھر رکھا ہوا تھا۔ مگر سرکتے سرکتے اب وہ صاف چشمہ پر آگیا ہے +

تب تو میں نے خیال کیا۔ اِس پتھر کو ہٹا دوں۔ چنانچہ میں **ہمّت** کو ساتھ لیکر چلا۔ مگر چند خونخوار وحشی درندوں نے مجھ پر حملہ کیا۔ اور پتھر سرکانے پر مجھے موت کا خوف دلایا۔ میں جان بچاکر ہٹا۔ میرے رہنما نے کہا۔ کہ اَور بھی تیری طرح اِس ارادہ پر آئے۔ مگر ان کے خوف سے بھاگ گئے۔ میں تجھے ایک مشعل دیتا ہوں۔ جس کی روشنی سے یہ اندھے ہوکر بھاگ جائینگے۔ چنانچہ **بصیرت** کی مشعل اُس نے مجھے دی۔ درحقیقت جب میں وہاں مشعل لیکر پہنچا۔ تو کوئی میرے پاس نہ آیا۔ آخر میں بفراغت پتھر سرکانے لگا۔ پر وہ ایک مجھ سے کب سرکتا تھا! میں تھک کر بیٹھ رہا۔ کہ **ہمدردی** نامی واعظ میرے سامنے آیا۔ اور کہا۔ کہ مجھے اجازت

دو۔ تو کچھ مدد کرنے والے لے آؤں۔ مَیں نے خوش ہوکر اُس کا شکر کیا۔ اور بڑے زور شور سے اُسے اپنی ہی صورت شکل والوں پاس بھیجا۔ پر افسوس کہ بہت کم لوگوں نے اُس کی بات سُنی۔ جو لوگ اُس نہر کا پانی پی چُکے تھے۔ وہ تو مارنے کو دوڑے۔ اور جو لوگ ابھی اُس سے بچے ہوئے تھے۔ اُن کے کان بہرے تھے۔ اُنھوں نے کچھ نہ سُنی۔ آخر وہ باحسرت و یاس واپس آیا۔ اُس کے لوٹنے کے بعد میں نے چاہا۔ کہ اِس خیال کو چھوڑدوں۔ اور یہ پتھر جیسا رکھا ہے ویسا ہی رہنے دوں۔ پر **استقلال** نامی ایک رجز خواں نے میرا دل بڑھایا۔ اور مجھے ایک تدبیر بتائی۔ اُس نے کہا۔ میں نے **ایمان** نامی فقیر سے سُنا ہے۔ کہ اِس چشمہ کا ایک کھودنے والا ہے۔ وہ سب مشکل حل کر سکتا ہے۔ مگر بڑی مشکل سے انسان کی رسائی اُس تک ہو سکتی ہے۔ اُس کی راہ میں اوّل تو مصیبت کا ایک بڑا میدان لق و دق ملتا ہے۔ جہاں سوائے آنکھ کے پانی کے پینے کو بھی کچھ نہیں۔ اگر اُس سے بچ گئے۔ تو رسوائی و بدنامی کے سات سمندر ملتے ہیں۔ جہاں صبر کی ٹوٹی پھوٹی کشتی کے سوا عبور کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تب دروازہ اُس کا ملتا ہے۔ جہاں اخلاص کی نذر پیش کرنی پڑتی ہے۔ اور دعا کے پاک صاف ہاتھوں کے ذریعہ سے پہنچائی جاتی ہے۔ تب وہ نذر قبول ہوتی ہے اور اجابت کا خلعت ملتا ہے۔ گو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ برسوں نذر کی قبولیت کی نوبت نہیں آتی۔ پس اگر تم کو اِس پتھر کے سرکانے کی خواہش ہے۔ تو وہاں تک جاؤ۔ اگر

اُس تک تمہاری رسائی ہوئی۔ اور اُس نے تمہاری نذر لے لی۔ تو وہ اقبال کو تمہارے ساتھ کریگا۔ جب تم اُس کو لوگوں کے سامنے لاؤ گے۔ سب کی آنکھیں کھُل جائیں گی۔ جو اب بند ہو رہی ہیں۔ تب وہ اپنے سوکھے ہوئے باغ کو دیکھکر تعجب کرینگے اور تمہارے ساتھ پتھّر سرکانے پر مستعد ہونگے۔ آخر چند ہی روز میں گدلے چشمہ کا پانی بند کرکے صاف چشمہ کے پانی سے اپنی نہریں بھر لیں گے اور اپنے باغ کو پہلے سے بھی زیادہ سرسبز اور شاداب کریں گے۔ تب یہ سوکھا ہوا باغ اُس ہرے باغ سے بھی تمہاری نظروں میں زیادہ سرسبز اور خوش نما معلوم ہوگا۔ کیونکہ نہ وہ باغ تمہارا باغ ہے۔ نہ وہاں کوئی تم سا ہے اور یہ باغ تمہارا ہی ہے اور سب تم سے ہیں۔ میں نے اُس رفیق کا شکر کیا اور اُس کے کہنے کے مطابق چلا۔ کہ دیکھوں اب کیا ہوتا ہے؟

جب میں عالمِ مثال سے لوٹا اور لوگوں سے یہ قصّہ کہا۔ تو وہ سب ایک ایک لفظ کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے۔ میں صرف یہ کہکر۔ کہ جو باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا۔ وہ علوم و فنون جدید کا باغ ہے۔ جس کے پھل پھول ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ پر ہمارا دل بہلانے والا وہاں کوئی نہیں ہے۔ اور جو باغِ خشک میں نے مشرق میں دیکھا۔ وہ ہمارے ہی علوم قدیمہ کا باغ ہے۔ جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے۔ وہ پتّھر جو سرچشمہ پر آگیا ہے۔ جہالت ہے۔ وہ ندی نالے گندے پانی کے رسم و رواج کی پابندی۔ نیکی نما تعصب۔ علم نما نادانی۔

جھوٹا زہد۔ جھوٹی شیخی۔ جاہلانہ تقلید۔ عامیانہ غلامی۔ ضرر انگیز حرارت۔ وحشیانہ تعلیم و تربیت ہے۔ جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے۔ جو کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں پاتے۔ چپ ہو رہا +

خواجہ الطاف حسین حالی

زبانِ گویا

اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطی شیوا بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان۔ سچ بتا۔ تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جُدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک ساحرِ فسوں ساز ہے۔ جس کے سحر کا رد۔ نہ جادو کا اُتار۔ کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے۔ جس کے زہر کی دارو۔ نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے۔ کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لُبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دِل دُکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے۔ کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی +

اے میری زبان دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن

کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے۔ جس کے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں +

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رُلانا۔ روٹھے کو منانا۔ اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تونے کہاں سیکھا ؟ اور کس سے سیکھا ؟ کہیں تیری باتیں بِس کی گانٹھیں ہیں۔ اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل۔ کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق +

اے زبان ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں۔ ہمارے ہزاروں نقصان اور ہزاروں فائدے۔ ہماری عزّت۔ ہماری ذلّت۔ ہماری نیک نامی۔ ہماری بدنامی۔ ہمارا جھوٹ۔ ہمارا سچ۔ تیری ایک ہاں اور ایک نہیں پر موقوف ہے۔ تیری اِس "ہاں" اور "نہیں" نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کا سر کٹوایا +

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا نہیں۔ مگر طاقت تیری نمونۂ قدرتِ الٰہی ہے۔ دیکھ۔ اِس طاقت کو رائیگاں نہ کھو۔ اور اِس قدرت کو خاک میں نہ ملا + راستی تیرا جوہر ہے۔ اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اِس جوہر کو برباد نہ کر۔ اور اِس زیور کو زنگ نہ لگا + تو دل کی امین ہے۔ اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دِل کی امانت میں خیانت نہ کر۔ اور روح کے پیغام پر حاشیئے نہ چڑھا +

اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے۔ اور کہیں تیرا لقب محرمِ راز۔ علم ایک خزانۂ غیبی ہے۔ اور دل اُس کا خزانچی۔ حوصلہ اُس کا قفل ہے۔ اور تو اُس کی کنجی۔ دیکھ اِس قفل کو بے اجازت نہ کھول۔ اور اِس خزانے کو بے موقع نہ اُٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے۔ اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصح مشفق تیری صفت ہے۔ اور مرشد برحق تیرا نام۔ خبردار! اِس نام کو عیب نہ لگانا۔ اور اِس فرض سے جی نہ چُرانا۔ ورنہ یہ منصبِ عالی تجھ سے چھن جائیگا۔ اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھیچڑا رہ جائیگا۔ کیا تجھ کو یہ اُمید ہے۔ کہ تو جھوٹ بھی بولے۔ اور طوفان بھی اُٹھائے۔ تو غیبت بھی کرے۔ اور تہمت بھی لگائے۔ تو فریب بھی دے۔ اور چُغلیاں بھی کھائے۔ اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے۔ نہیں! ہرگز نہیں!! اگر تو سچّی زبان ہے۔ تو زبان ہے۔ ورنہ زبون ہے۔ بلکہ سراسر زیان ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے۔ تو شہد فائق ہے۔ ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے۔ تو ہمارے مُنہ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائیگی۔ ورنہ گُدّی سے کھینچکر نکالی جائیگی +

اے زبان جنھوں نے تیرا کہنا مانا۔ اور جو تیرا حکم بجا لائے۔ اُنھوں نے سخت الزام اُٹھائے اور بہت پچتائے۔ کسی نے اُنھیں فریبی اور مکّار کہا۔ کسی نے گستاخ اور مُنہ پھٹ اُن کا نام رکھا۔

کسی نے ریاکار ٹھیرایا۔ اور کسی نے سخن ساز۔ کسی نے بدعہد بنایا۔ اور کسی نے غمّاز۔ غیبت اور بہتان۔ مکر اور افترا۔ طعن اور تشنیع۔ گالی اور دشنام۔ پھکّڑ اور ضلع جگت اور پھبتی۔ غرض دنیا بھر کے عیب اُن میں نکلے۔ اور وہ سب کے سزاوار ٹھیرے +

اے زبان! یاد رکھ۔ ہم تیرا کہا نہ مانینگے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئینگے۔ ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائینگے۔ ہم جان پر کھیلینگے۔ پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائینگے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائینگے +

اے زبان ہم دیکھتے ہیں۔ کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھکر محبت کے جوش میں آتا ہے۔ تو بے اختیار ہنہناتا ہے۔ اور کُتّا جب پیار کے مارے بیتاب ہو جاتا ہے۔ تو اپنے مالک کے سامنے دُم ہلاتا ہے۔ سُبحان اللہ! وہ نام کے جانور۔ اور اُن کا ظاہر و باطن یکساں۔ ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں "نہیں" اور زبان پر "ہاں" +

الٰہی! اگر ہم کو رخصتِ گفتار ہے۔ تو زبانِ راست گفتار دے۔ اور اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے۔ تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں۔ سچّے کہلائیں۔ اور جب تیرے دربار میں آئیں۔ تو سچّے بن کر آئیں +

(حالی)

حیات سعدی

شیخ کا نام ۔ نسب ۔ ولادت اور بچپن

اُس کا نام شرف الدین اور مُصلح لقب اور سعدی تخلّص ہے۔ سرگور اوسلی نے اُس کی ولادت ۵۸۹ھ ہجری مطابق ۱۱۹۳ء میں لکھی ہے۔ مگر وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے اتابک مظفر الدین تُکلہ بن زنگی کے عہدِ حکومت میں پیدا ہوا ہے۔ شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتابک سعد زنگی اپنے بھائی تکلہ بن زنگی کی جگہ تخت شیراز پر متمکّن ہوا تھا۔ چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا اور نیز شیخ کا باپ عبد اللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا۔ اِس لئے اُس نے اپنا تخلّص سعدی قرار دیا۔ شیخ کا باپ جیساکہ اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ ایک باخدا اور متورع آدمی تھا۔ شیخ کے بچپن کا حال اِس سے زیادہ معلوم نہیں۔ کہ نماز روزہ کے مسائل اُس کو بہت تھوڑی عمر میں یاد کرائے گئے تھے اور بچپن ہی میں اُس کو عبادت۔ شب بیداری اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا۔ عید اور تہواروں میں ہمیشہ باپ کے ہمراہ رہتا تھا اور کہیں آوارہ پھرنے نہ پاتا تھا۔ باپ اُس کے افعال و اقوال کی نگرانی عام باپوں کی نسبت زیادہ کرتا اور بے موقع بولنے پر زجر و توبیخ کرتا تھا۔ شیخ نے اپنی تربیت کا بڑا سبب اِسی

باپ کی تادیب اور زجر و توبیخ کو قرار دیا ہے ✲

شیخ کی تعلیم کا حال

اگرچہ شیخ کا باپ ایک درویش مزاج آدمی تھا اور بچپن میں شیخ کو بہ نسبت علم حاصل کرنے کے زہد و عبادت اور صلاح و تقوے کی زیادہ ترغیب دی گئی تھی۔اس کے سوا شیخ ابھی جوان نہ ہونے پایا تھا۔کہ باپ کا اِنتقال ہو گیا۔ مگر اُس نے ہوش سنبھالتے ہی شیراز اور اُس کے قرب و جوار میں علما اور مشائخ اور فُصحا اور بُلغا کی ایک جماعت کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی اور اُن سے بھی زیادہ ایک جم غفیر کا شہرہ جو خطۂ فارس میں اہلِ کمال ہو گزرے تھے۔ بزرگوں سے سُنا تھا۔ قاعدہ ہے کہ بزرگوں اور کاملوں کے دیکھنے یا اُن کی شہرت اور ذکر خیر سُننے سے ہونہار لڑکوں کے دل میں خود بخود اُن کی ریس اور پیروی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے تحصیل علم کا شوق اُس کو دامنگیر ہوا۔ گرچہ دار العلم شیراز میں تحصیل علم کا سامان مہیا تھا۔ علماے جلیل القدر درس و تدریس میں مشغول تھے۔ مدرسۂ عضدیہ جوکہ عضد الدولہ دیلمی نے قائم کیا تھا۔ اور اُس کے سوا اَور مدرسے وہاں موجود تھے۔ لیکن اُس وقت وہاں ایسی ابتری اور خرابی پھیلی ہوئی تھی۔ کہ اہلِ شیراز کو ایک دم اطمینان نصیب نہ تھا۔ اگرچہ اتابک سعد بن زنگی نہایت عادل۔ رحم دل۔ بامُروّت اور فیاض بادشاہ تھا۔ مگر اُس کی طبیعت میں۔ اولو العزمی۔

حد سے زیادہ تھی۔ اکثر شیراز کو خالی چھوڑ کر عراق کے حدود میں لشکر کشی کرتا رہتا تھا۔ اور اپنی مہمّات کے شوق میں ممالک محروسہ کو بالکل فراموش کر دیتا تھا۔ اُس کی غیبت کے زمانہ میں اکثر مفسد لوگ میدان خالی پاکر اطراف و جوانب سے شیراز پر چڑھ آتے تھے اور قتل و غارت کرکے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ ساتویں صدی کے آغاز میں اوّل اتابک اوزبک پہلوان نے اور پھر چند روز بعد سلطان غیاث الدین نے بہت سے لشکر کے ساتھ آکر شیراز کو ایسا تاخت و تاراج کیا۔ کہ اُس کی تباہی اور بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا۔ ایسی حالت میں تحصیل علم کی فرصت شیخ کو وطن میں ملنی دشوار بلکہ ناممکن تھی۔ اس کے علاوہ امن کے زمانہ میں بھی وطن کے مکروہات اور موانع ہمیشہ تحصیل علم میں رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ یہ اسباب تھے۔ جنھوں نے شیخ کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ چنانچہ ذیل کے اشعار میں اُس نے شیراز سے تنگ آکر بغداد جانے کا ذکر کیا ہے۔

دلم از صحبت شیراز بہ کُلّی بگرفت	وقت آنست کہ پرسی خبر از بغدادم
سعدیا حُبّ وطن گرچہ حدیثیست صحیح	نتواں مُرد بسختی کہ من اینجا زادم

ترجمہ۔ میرا دل شیراز کی صحبت سے تنگ آگیا۔ اب وہ وقت ہے۔ کہ مجھ سے بغداد کا حال پوچھو + اے سعدی وطن کی محبت اگرچہ صحیح بات ہے۔ مگر اس ضرورت سے کہ میں یہاں پیدا ہوا ہوں۔ سختی میں مرا نہیں جاتا +

شیخ کے عام حالات

شیخ ایک نہایت صحیح المزاج قوی اور جفا کش آدمی تھا۔ اُس کے قویٰ کا اندازہ اِس سے ہو سکتا ہے۔ کہ اُس نے دس بارہ حج پیادہ پا کئے تھے۔ اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصّہ صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی میں بسر کیا۔ اور ایک سو بیس برس کے قریب عمر پائی +

اُس نے صرف پیادہ پا ہی سفر نہیں کئے۔ بلکہ بعض اوقات ننگے پاؤں چلنے کا بھی اتفاق ہوتا تھا۔ جس طرح اکثر اہلِ سلوک نفس شکنی کے لئے اپنے مشائخ کے اشارہ سے سالہا سال ادنیٰ درجہ کے کام اور محنتیں کیا کرتے ہیں۔ اُس نے بھی بیت المقدّس اور اُس کے گرد و نواح میں ایک مدّت تک سقّائی کی تھی +

اُس کو تذکرہ نویسوں نے اہلِ باطن اور صوفیہ میں سے شمار کیا ہے۔ اُس کے کلام سے بھی جابجا یہی مترشح ہوتا ہے۔ کہ وہ اِس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بے شک وہ صوفی بھی تھا اور واعظ بھی۔ مگر آج کل کے مشائخ اور واعظین کے برخلاف۔ ایک نہایت بے تکلف کھُلا ڈُلا۔ یار باش۔ ہنسوڑ۔ ظریف۔ ریا اور نمائش سے دور۔ سیدھا سادہ مسلمان تھا۔ اُس کو آج کل کے حضرات کی طرح اپنے تئیں لوازم بشریت سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور بہ تکلّف مقدّس فرشتوں کی صورت میں جلوہ گر ہونا ہرگز نہ آتا تھا + وہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ مگر مشرق کے عام شعرا کی طرح حریص اور لالچی نہ تھا۔

اُس نے مثل ظہیر۔ رشید۔ خاقانی اور انوری وغیرہم کے بادشاہوں کی مدّاحی اور امیروں کی بھٹئ کرنے کو اپنی وجہ معاش نہیں بنایا تھا۔ با اینہمہ وہ اُمرا اور سلاطین سے ملتا بھی تھا اور اُن کی مدح میں قصیدے بھی لکھتا تھا اور جو کوئی عقیدت یا محبّت سے اُس کی کچھ نذر کرتا تھا۔ وہ لے بھی لیتا تھا۔ اُس کے عام مدحیہ قصائد دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ وہ یہ قصیدے کس غرض سے لکھتا تھا۔ زیادہ تر اُس کے قصیدے ایسے ہیں۔ جن کو قصیدہ گوئی کے مشرقی اُصول کے موافق بہت مشکل سے قصیدہ کہا جاسکتا ہے۔ امیروں سے وہ اس لئے بھی زیادہ تر میل جول رکھتا تھا۔ کہ اکثر اُس کی سفارش سے (جیساکہ گلستاں کی بعض حکایتوں سے پایا جاتا ہے) غریب آدمیوں کے کام نکل جاتے تھے +

خود داری اور غیرت اُس میں ایسی تھی۔ کہ نہایت ضرورت اور احتیاج کے وقت بھی وہ وضع کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ جیساکہ اسکندریہ کے قحط میں اُس سے ظہور میں آیا۔ خلقت کی خیر خواہی اور ہمدردی خدا تعالےٰ نے اُس کی سرشت میں ودیعت کی تھی۔ اُس کے نصائح اور مواعظ ہرگز اس قدر مقبول نہ ہوتے۔ اگر انسانی ہمدردی کا جوش اُس کے دل میں نہ ہوتا۔ اُس نے اپنی زبان اور قلم کو پند و نصیحت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اور حق بات کہنے سے خطرناک موقعوں پر بھی نہ چوکتا تھا۔ کوئی شخص کسی چیز میں کامل نہیں ہو سکتا۔ جب تک دو باتیں جمع نہ ہوں۔ ایک جوہر فطری۔ دوسرے زمانہ کے

ایسے اتفاقات - جو اُس کی جِلا کے باعث ہوں - شیخ کی ذات میں جس قسم کی قابلیت تھی - اُسی کے موافق اُس کو اتفاقات پیش آئے تھے - جس شہر میں وہ پیدا ہوا تھا - وہ خود ایک مردم خیز خطّہ تھا - جہاں ہونہار بچّوں کو خود بخود کسبِ کمال کی ترغیب ہونی چاہئے - یتیمی اور بے پدری اگرچہ اکثر صورتوں میں آوارگی اور ابتری کا سبب ہوتی ہے - لیکن بسا اوقات ایسی مجبوری اور بے کسی کی حالتیں غیرت مند اور جفاکش لڑکوں کے حق میں ترقّی اور رُشد کا باعث ہوئی ہیں +

جس مدرسہ میں وہ حُسنِ اتفاق سے تحصیلِ علم کے لئے پہنچا - وہ تمام مدارسِ اسلامیہ میں ممتاز اور سر برآوردہ تھا - اور جس دار الخلافت[۵] میں وہ مدرسہ واقع تھا - وہاں کی سوسائٹی اُس وقت تقریباً تمام دنیا کی سوسائیٹیوں کی نسبت زیادہ شائستہ اور مہذّب تھی - اُس نے صرف درس و کتاب ہی سے اِستفادہ حاصل نہیں کیا تھا - بلکہ زمانہ نے بھی اُس کی تادیب خاطر خواہ کی تھی - اُس کی عمر کا ایک بہت بڑا اور مفید حصّہ نہایت کٹھن اور دور و دراز سفر کرنے اور دنیا کے عجائبات اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھنے میں بسر ہوا تھا - سلطنتوں کے پے در پے اِنقلابات اور ملکوں کے متواتر تغیرات - ظالم بادشاہوں اور بے رحم عاملوں کے ظلم و ستم دیکھتے دیکھتے بنی نوع کی دلسوزی اور ہمدردی اُس کی طبیعت میں راسخ ہوگئی تھی - بیسیوں خاندان اُس کی آنکھوں کے سامنے بنے - اور بیسیوں بگڑ گئے - ایک بار جیسا کہ گلستاں میں مذکور ہے

[۵] بغداد +

شام میں اُس کے روبرو ایسا اِنقلاب ہوا۔ کہ وزیروں کی اولاد بھیک مانگنے لگی۔ اور روستائی زادے وزارت کے درجے کو پُہنچ گئے ٭

ساتویں صدی میں۔ جس میں کامل عقل و ہوش کے ساتھ اُس نے اکیانوے برس بسر کئے تھے۔ عجیب و غریب تماشے اُس کی نظر سے گزر گئے۔ سلاطین کُردیۂ کا خاندان جن کی سطوت و جلالت۔ ایشیا۔ افریقہ و یورپ میں یکساں مانی جاتی تھی۔ اسی صدی میں تمام ہوا۔ سلاجقۂ قونیہ۔ اور خوارزم شاہیوں کی نہایت سخت لڑائی جس نے دونوں سلسلوں کو مضمحل کر دیا۔ اِسی صدی میں ہوئی۔ پھر خوارزمیوں کی سلطنت جو بحیرۂ خزر اور جھیل یورال سے دریاے سندھ اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اِسی صدی میں تاتاریوں کے ہاتھ سے برباد ہوئی۔ بنی عباس کی خلافت سَوا پانسو برس بعد اِسی صدی میں ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہوئی۔ اور بقول بعض مورخین کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کا خون مغلوں کی تلوار سے دجلہ کی ریتی میں بہہ گیا۔ دمشق اور اسکندریہ کا قحط جس کا ذکر گلستان اور بوستان میں ہے۔ اور مصر کا قحط جس میں حسب تصریح صاحبِ وَصّاف ایک ایک روٹی ہزار ہزار دینار کو بِک گئی۔ اور فارس کا قحط جس میں ایک لاکھ آدمی بھوکا مرگیا۔ اِسی صدی میں واقع ہوے۔ اتابکان فارس کے خاندان پر اِسی صدی میں زوال آیا۔ دار الملک شیراز جو شیخ کا مولد و مسکن تھا۔ اِسی صدی میں کئی بار قتل اور غارت کیا گیا۔

فرقۂ اسماعیلیہ جو پونے دو سو برس مشرق میں نہایت زور شور کے ساتھ حکمراں رہا۔ اُن کا خاتمہ تاتاریوں نے ایران میں اور کُردوں نے شام میں ہمیشہ کے لئے اِسی صدی میں کیا۔ یہ تمام حوادث اور وقائع شیخ کے سامنے ظہور میں آئے تھے۔ جن سے ایک صاحب بصیرت آدمی بے انتہا عبرت اور نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ بغداد کا مرثیہ۔ جو اُس نے عربی میں لکھا ہے۔ اُس میں کہتا ہے۔ "خدا حمایت کرے اُس شخص کی۔ جو خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد مُتنبّہ ہو گیا کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لئے تازیانہ ہے"۔ یورپ کے مشہور مُصنّف ہگ ملر صاحب کا قول ہے۔ کہ میں نے عمدہ تعلیم صرف ایک اسکول یعنی مدرسۂ روزگار میں پائی ہے۔ جس میں محنت اور مصیبت دو بڑے گرم جوش اور دل سوز اُستاد تھے +

شمس العلما مولوی سیّد نذیر احمد صاحب

(از رویاے صادقہ)

ریاضت جسمانی

ایک تو ہمارے یہاں کے کھیل ہیں۔ جن میں سے اکثر بے سود اور بے سود ہوں تو خیر! اُلٹے مُضر۔ بد اخلاقی کی تمہید۔ کاہلی کی تعلیم۔ اور بعض میں جو کچھ دماغی فائدے نکل سکتے ہیں۔ مثلاً گنجفے میں حافظے کی ترقی۔ چوسر شطرنج میں غور اور خوض کی عادت۔ تو اُن میں بڑی قباحت یہ ہے۔ کہ دنیاوی معاملات میں اُن سے مطلق مدد نہیں ملتی۔ اگر کوئی شخص گنجفہ اچھّا کھیلتا ہے۔ تو اِس کے یہ معنی ہیں۔ کہ اُس کو پتّوں کی یاد داشت اچھّی ہے۔ لیکن بازیوں کے ورق یاد رکھنے سے کتابوں کے ورق تو کیا! صفحہ بلکہ دو چار سطریں بھی یاد نہیں ہو سکتیں۔ اِسی طرح بڑے سے بڑا شاطر شطرنج کے نقشے میں خوب طبیعت لڑاتا ہے۔ مگر ایک سیدھا سا مقدّمہ اُس کے سامنے بیان کرو۔ تو سمجھ نہیں سکتا۔ تدبیر سوچے گا کیا اپنا سر۔ غرض ہندوستانیوں کے جتنے کھیل ہیں۔ سب نکمّے۔ موجبِ تضئیعِ وقت + اب مدرسہ کے کھیلوں پر نظر کرو۔ تو نری جسمانی ریاضت۔ اور تفریحِ طبع کے علاوہ دماغی زحمت کا کچھ دخل نہیں۔ کیونکہ اوقاتِ درس میں جتنی دیر پڑھنے میں مصروف رہے۔ بس دماغی محنت بہتیری ہولی۔ اب کھیل

میں بھی شطرنج کی طرح سوچنا پڑے۔ تو دماغ کہاں تک اس فشار کو وفا کر سکتا ہے۔ اور اگر جسم سے بالکل کام نہ لیا جائے۔ تو جس طرح گھوڑا تھان پر بندھے بندھے ہڈے موترے نکال لاتا۔ بادی میں بھر جاتا۔ دانہ گھاس اچھی طرح ہضم نہیں کر سکتا۔ تھوڑی دور چلنے سے ہانپنے لگتا۔ کوس دو کوس دوڑانا چاہو۔ تو دوڑ نہیں سکتا۔ یہی حال آدمی کا ہے۔ کہ اگر وہ اپنے ہاتھ پانوں سے کام نہیں لیتا۔ تو اگر اَور کوئی بیماری اُس کو نہ بھی ستائے۔ یہ کیا تھوڑی بیماری ہے۔ کہ وہ اپاہج ہو جاتا ہے۔ اِسی آرام طلبی کے نتیجے ہیں۔ کہ ہماری عمروں کے اوسط گھٹتے اور ہماری نسلیں کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں ؁

خیر کابل کے پٹھانوں اور گوروں کے ساتھ ہم ہندوستانی گڑئیں کیا مقابلے کرینگے۔ اپنے ہی مُلک کے دیہاتی کبھی شہر میں آنکلتے ہیں۔ تو اُن کو دیکھکر عقل حیران ہو جاتی ہے۔ کہ الٰہی یہ بھی آدمی ہیں! جن کی کاٹھیاں لوہے کی اور ہاتھ پانوں پتھر کے ہیں۔ معلوم ہے کہ ساگ بھوجی اور جوار باجرے کی روٹی کے سوا اَور کچھ مُیسّر نہیں آتا۔ مگر یہ آنکھوں دیکھی بات ہے۔ کہ ایک دیہاتی سو سوا سو من کی چوبلدی گاڑی ہانکے لئے چلا جا رہا تھا۔ شہر کی بھیڑ دیکھکر بیل ہدکے۔ کہ گاڑی کا ایک پہیہ نالی میں جاتا رہا۔ بیلوں نے بہتیرا زور مارا پہیہ جگہ سے نہ کِھسکا۔ گاڑیبان نے اُتر کر کمر کا سہارا لگا بات کی بات میں گاڑی کو ایسا دھکا دیا کہ بیچ سڑک میں۔ نہ دیہاتیوں کا پانی۔ نہ شہریوں کا ماء اللحم۔

نہ اِن کا چبینا اور نہ ہمارے بادام پستے۔ بیشک شہر اور دیہات کی آب و ہَوا میں بھی بہت بڑا فرق ہے۔ مگر دیہاتیوں کی توانائی اور اُن کا ٹانٹا پن ہے محنت کی وجہ سے۔ شہر کی ایک تو کثرت آبادی کی وجہ سے آب و ہَوا خراب۔ اُس پر محنت مشقّت ندارد۔ جس کو دیکھو بدن پر بوٹی نہیں۔ اور بوٹی ہو۔ تو کہاں سے ہو۔ بیچارے کو کبھی کُھلکر بھوک نہیں لگتی۔ اور مارے ہَوکے کے کچھ بے اشتہا کھا لیتا ہے۔ تو ہضم نہیں ہوتا۔ اور جو ہم میں پہلوان کہلاتے ہیں۔ سینہ اُبھرا ہوا ہے۔ قبضے چڑھے ہیں۔ دیکھنے کو موٹے تازے۔ داؤ پیچ بھی خوب رواں۔ مگر اصلی بل بوتا اِن میں بھی نہیں +

اِس پر ایک حکایت یاد آئی ہے۔ کہ جن دنوں قلعہ آباد تھا۔ تو سلاطین کو سوائے اوقات گزاری کے اَور کوئی کام نہ تھا۔ نکمّے بیٹھے بیٹھے اِن کو ایسے ہی مشغلے سوجھتے تھے۔ کہ ستار بجا رہے ہیں یا بٹیر لڑا رہے ہیں یا شطرنج کھیل رہے ہیں۔ یا اس کی دُھن ہے۔ کہ کوئی ایسی قسم کا کھانا پکوائیے۔ کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ چنانچہ ایک صاحب عالم کو پہلوانوں کی کُشتی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ بہت سے پہلوانوں کے راتب بندھے تھے اور اُنھوں نے ایسی ایسی جوڑیں تیار کی تھیں۔ کہ رجواڑوں میں جا جاکر کُشتیاں مارتے تھے۔ ایک مصاحب کو یہ سوجھی۔ کہ اِن دنوں ولایتی میوہ فروش آئے ہوئے ہیں۔ کسی ولایتی کو ایک پہلوان سے لڑوایا جائے۔ صاحب عالم اِس ایجاد کو سُنکر پھڑک گئے۔ اور فرمایا بھئی واللہ تخت

کی قسم ہے! کیا بات پیدا کی ہے! معمولی کُشتیاں دیکھتے دیکھتے جی اُکتا گیا۔ ولایتی کی کُشتی میں مزہ تو خوب آئے گا۔ دیکھیں وہ پیچ کا کیا توڑ کرتا ہے۔ داروغہ جی دینا ان کو ایک دوشالہ۔ اور بھائی تم ہی اس کُشتی کا اہتمام بھی کرنا۔ اور میں حضور میں بھی عرض کروں گا۔ سرفراز فرمائیں گے + + + + + + + +

نہیں معلوم۔ ظالموں نے کیا تدبیر کی۔ کہ ایک اکھڑ وحشی ولایتی کو کچھ دیکر شاہی پہلوان کے ساتھ لڑنے کو راضی کرلیا۔ ولایتی کو ہم نے بھی دیکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ مارے دہشت کے نظر نہیں ٹھیرتی تھی۔ آدمی کاہے کو تھا۔ ایک دیو کا دیو تھا۔ بالوں کی لٹیں کندھوں تک لٹکتی ہوئیں۔ میلے کثیف کپڑے۔ چار چار پانچ پانچ گز سے مست دُنبے کی سی بُو آتی تھی۔ ایسی سخت۔ کہ ناک نہ دی جائے۔ پیٹھ پر ہینگ کا مشکیزہ۔ اِدھر جوتیوں سے۔ اُدھر مشکیزہ سے چیڑ چیڑ کی آواز چلی آئے۔ خونخوار آنکھیں۔ ڈراؤنی صورت۔ لوگ جو اُس کو بہلا پھُسلاکر لائے تھے۔ اُس کے گرداگرد ایسے معلوم ہوں۔ جیسے بڑے آدمی کے آگے بچّے۔ اور یہاں اکھاڑے میں پہلوان پڑے جھوم رہے تھے۔ کوئی ڈنڑ پیل رہا ہے۔ اور کوئی تین سوا تین من کی جوڑی کے رومالی ہاتھ اِس خوبصورتی اور صفائی سے ہلا رہا ہے۔ کہ سارے تماشائیوں کی ٹکٹکی اُس پر بندھی ہے۔ کوئی لیزم کی کثرت کر رہا ہے۔ کوئی بنیٹی کے کرتب دکھا رہا ہے۔ اِتنے میں غُل ہوا۔ کہ وہ پٹھان آیا۔ جوں اُس کو لاکر

اکھاڑے کے پاس کھڑا کیا۔ اُس کا پھیلاؤ دیکھکر پہلوانوں کا رنگ فق
ہوا۔ اب کسی کی ہمّت نہیں پڑلی۔ کہ موت کے مُنہ میں جائیے۔ اور
ولایتی ہے کہ زمین میں آلتی پالتی مارے ہینگ کے مشکیزہ کا گاؤ تکیہ
بنائے نظر حیرت و تعجب سے سب کو بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ اور ان پہلوانوں
کو سمجھتا ہے۔ کہ نٹوں کا تماشا کر رہے ہیں +

اکھاڑے کا اُستاد اگرچہ تھا تو عمر سے اُترا ہوا۔ مگر اُس کا بدن ایسا
مرتب تھا۔ اور اُس کو ایسے ایسے داؤ گھات یاد تھے۔ کہ بکایک کوئی اُس
سے لڑنے کی ہامی نہیں بھرتا تھا۔ مگر وہ خوب جانتا تھا ع

فربہی چیزے دگر۔ آماس چیزے دیگر است

اُس نے چپکے سے صاحب عالم کے پاس جاکر عرض کیا۔ کہ آج تک
آپ کے اکھاڑے نے کسی سے نیچا نہیں دیکھا۔ اور اُستاد کی برکت
سے ہمارے یہاں کے پٹھے بھی اپنے وقت کے رستم و اِسفندیار ہیں۔
لیکن سرکار راجرؔس کے چاقو کو قصائی کے بُغدے سے بھڑاتے ہیں۔
ساری عمر ہم نے سرکار کا نمک کھایا۔ حکم کی تعمیل میں مجالِ عذر نہیں
پچھڑیں گے تو نہیں۔ مگر اس کے ہاڑ تو ملاحظہ کیجئے۔ کہ کلائی دونوں
ہاتھوں میں سمانی مشکل ہے۔ سرکار کو جان ہی لینی منظور ہے۔ تو بسم اللہ!
اس کا دبوچا ہوا آدمی بھٹکا بھی تو نہیں کھانے کا۔ اونٹ کی پکڑ کو
اس کی پکڑ سے کیا نسبت! صاحب عالم سمجھے تو سہی۔ مگر سارے ہیں
غل مچوا چکے تھے۔ کس طرح کشتی کو ملتوی کر دیتے! +

بارے لوگوں نے ولایتی سے کہا۔ کہ آغا اِن لوگوں میں سے جس کے ساتھ تمھارا جی چاہے کُشتی لڑو + آغا۔ ہم سب کے ساتھ لڑیگا +

اب تو پہلوانوں کے دم میں دم آیا۔ خیر ایک کی دارو دو۔ اُستاد اور شاگرد سارے کا سارا اکھاڑا اکیلے کو لپٹ پڑا۔ جو جو داؤ پیچ یاد تھے۔ سبھی لتے تو چلائے۔ آغا ہیں کہ قطب از جا نہ جنبد۔ لوہے کی لاٹ کی طرح گڑے ہوئے کھڑے ہیں +

اِن لوگوں نے نادانی یہ کی۔ کہ آغا سے گُتھ گئے۔ اُس نے موقع پا ایک کو تو اِس بغل میں دابا۔ اور دوسرے کو دوسری بغل میں۔ اُس نے تو اپنے نزدیک آہستہ ہی سے دبایا تھا۔ مگر اُن میں کا ایک تو آج تک کوب لئے پھرتا ہے اور دوسرا مدّتوں خون تھوکتا رہا۔ اب سُنا اچھّا تو ہوگیا ہے۔ مگر جاڑے کے دنوں میں مارے پسلیوں کے درد کے بیچارے سے سانس نہیں لیا جاتا +

خیر بنی آدم میں یہ ولایتی پٹھان تو اَور ہی نسل کے ہیں۔ اور اُن کی سی بات حاصل کرنی تو مشکل بلکہ محال ہے۔ مگر اِس کے عقلی دلائل موجود ہیں۔ کہ اگر ہم اپنے طرز تمدّن میں صفائی کے قاعدوں کی پوری پوری رعایت کریں۔ اور جسمانی ریاضت کی عادت ڈالیں۔ تو آیندہ کی نسلیں بہت بہتر ہو سکتی ہیں۔ یہ سچ ہے۔ کہ ہم لوگ گرم ملک کے رہنے والے ٹھیرے۔ ہم کو خدا نے محنت کے لئے پیدا نہیں کیا۔ اور نہ ہم سے محنت کا تحمل ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر شاقّہ محنت

نہ ہو۔ تو جس قدر برداشت کی جا سکتی ہے۔ وہ بھی سو دَوا کی ایک دوا ہے۔ اور پھر ہلدی لگے نہ پھٹکری + (نذیر احمد)

عقل کی نارسائی (از ابن الوقت)

بلا شبہ مبداء فیّاض نے اِنسان کو ظاہری باطنی جتنی قوّتیں دی ہیں۔ سب میں عقل بڑی زبردست ہے۔ اور وہی مدارِ تکلیف شرع بھی ہے۔ لیکن بیش بریں نیست۔ کہ عقل بھی ایک قوّت ہے۔ اور جس طرح انسان کی دوسری قوّتیں محدود اور ناقص ہیں۔ مثلاً آنکھ کہ ایک خاص فاصلے پر دیکھ سکتی ہے۔ اُس سے باہر نہیں۔ پھر بے روشنی کے کام نہیں دیتی۔ اجسامِ کثیف میں نفوذ نہیں کرتی۔ اگر دیکھنے والا خود متحرّک ہو۔ مثلاً فرض کرو۔ کہ کشتی یا ریل میں ہو۔ تو وہ اُلٹا ٹھیری ہوئی چیزوں کو متحرّک دیکھتا ہے۔ اور اپنے تئیں ٹھیرا ہوا۔ تیز حرکت متشکّل معلوم ہوتی ہے۔ جیسے لڑکے گُلٹی سے کھیلتے ہیں۔ پیالے میں تھوڑا سا پانی بھر کر لکڑی کھڑی کریں۔ تو لچکی ہوئی دکھائی دے گی۔ شفّاف پانی کی تہ کی چیزیں اوپر کو اُبھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور اِسی طرح اَور بہت سی غلطیاں نظر سے ہوتی ہیں۔ جن کی تفصیل علم مُناظر میں موجود ہے + غرض جس طرح مثلاً ہماری قوّتِ باصرہ محدود اور ناقص ہے۔ اِسی طرح عقل کی رسائی کی بھی ایک حد ہے۔ وہ بھی نقصان سے بری نہیں۔ اور اُس سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ غلطی

کے لئے تو اختلاف رائے کی دلیل کافی ہے۔ ہندسہ کے علاوہ جس کے اُصول بدیہیات پر مبنی ہیں۔ اور اِسی وجہ سے اُس میں اختلاف ہو نہیں سکتا۔ ڈاکٹر۔ فلسفی۔ جج۔ ایسٹرانومرز† (ہیائت داں) پالٹیشنز* (مدبّرانِ ملک) اہل مذاہب وغیرہ وغیرہ۔ سبھی کو دیکھتے ہیں۔ کہ ایک دوسرے سے لڑتے مرتے ہیں۔ مَنطق کے قاعدے منضبط ہوئے۔ مُناظرے کے اُصول ٹھیرائے گئے۔ مگر اختلاف نہ کم ہوا اور نہ تا قیامت کم ہو۔ جب ہست و نیست کا اختلاف ہو۔ تو ضرور ایک بر سر غلط ہے +

اگرچہ عقل انسانی کا نقصان اختلاف رائے سے بھی مستنبط ہو سکتا ہے۔ مگر ہم ذرا اِس کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ دو ڈھائی سو برس کے عرصے میں اہلِ یورپ کو سیکڑوں باتیں ایسی دریافت ہوئیں۔ کہ کسی کو کیمیا کا حُکمی نسخہ مل گیا ہوتا اور وہ اُس کو عام بھی کر دیتا۔ تو اِتنا فائدہ نہ پہنچتا۔ جتنا کہ اِن ماڈرن ڈسکوریز‡ یعنی زمانۂ حال کی دریافتوں سے ہوا۔ اور جن اقبال مندوں کو خدا نے واقعات اور موجوداتِ نفس الامری میں غور و خوض کرنے کی دُھن لگا دی ہے۔ خدا اُن کی کوششوں کو مشکور و کامیاب کرتا ہے۔ بحرِ بے پایاں موجودات میں غوطے لگا رہے ہیں۔ اور معلومات جدید کے بے بہا موتی ہیں۔ کہ برابر نکلے چلے آتے ہیں۔ اِن ماڈرن

---

† ایس ٹرانُ مَر = واحد۔ ز علامت جمع		‡ ڈِس کَ وَری = واحد۔ ز علامت جمع

* پالِی ٹِشَن = واحد۔ ز علامت جمع

ڈِس کوریز میں سے (زیادہ نہیں) صرف ایک چیز عام فہم لو- جس سے انگریزوں کے طفیل میں ہم بھی فائدہ اُٹھا رہے ہیں- ریل- اب ہم پوچھتے ہیں- کہ دنیا میں گھر گھر آگ تھی- گھر گھر ہنڈیاں پکتی تھیں- ہر ہر متنفّس بھاپ سے بخوبی واقف تھا- سیکڑوں ہزاروں برس پہلے سٹیم (بھاپ) کی طاقت کیوں نہیں معلوم ہوئی- اور یہی سوال ہر ڈِس کوری کی بابت ہو سکتا ہے- جو اب تک ہوئی یا آیندہ کسی وقت میں ہو +

سر اسحٰق نیوٹن جس کو سب سے پہلے مسئلہ کشش کا الہام ہوا- کہتا تھا- کہ خدا کی بے انتہا قدرت کے سمندر میں بے شمار موتی بھرے پڑے ہیں- اور میں تو ابھی کنارے پر بیٹھا ہوا بچّوں کی طرح سیپیاں اور گھونگے جمع کر رہا ہوں- یہ مقولہ تھا اُس شخص کا- جس نے زمین اور آسمان کے قلابے ملاکر نظام بطلیموس کی جگہ اپنا نظام قائم کیا- اور آج سارا یورپ اُس کے نام پر فخر کرتا ہے- جن کو خدا نے عقل دی ہے- وہ تو یوں اپنی نارسائی کا اعتراف کرتے ہیں- اور ایک ہمارے زمانے کے انگریزی خواں ہیں- کہ سیدھی سی اُقلیدس کی نئی شکل پوچھو- تو بغلیں جھانکنے لگیں- اور لن ترانیاں یہ- کہ ہمچو ما دیگرے نیست- پس جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے- عقل انسانی کا قصور ہے- کہ کھُلتا چلا جاتا ہے- اب سے زیادہ نہیں صرف ڈیڑھ سو برس پہلے کسی کی عقل میں یہ بات آسکتی تھی- کہ مہینوں کی مسافت

ہم گھنٹوں میں طے کر سکیں گے۔ یا ہزارہا کوس کا حال چند لمحے میں معلوم کر لیا کرینگے۔ یا آگ سے برف جمائینگے یا کپڑے کی کل میں کپاس بھرکر اچھے خاصے ڈھلے دھلائے تہ کئے ہوئے تھان نکال لیا کرینگے۔ اور ابھی کیا معلوم۔ کہ ہم کیا کیا کر سکینگے۔ مگر پھر بھی رہینگے آدمی۔ عاجز۔ ناچیز۔ بے حقیقت +

بھلا آدمی کیا عقل پر ناز کریگا۔ جب کہ اُس کو پاس کے پاس اتنا تو معلوم ہی نہیں۔ کہ روح کیا چیز ہے۔ اور اُس کو جسم کے ساتھ کس طرح کا تعلّق ہے۔ وقت کے اَزلی اَبدی ہونے پر خیال کرتے ہیں۔ تو انسان کی ہستی ایسی بے ثبات دکھائی دیتی ہے۔ جیسے دن رات میں ایک طَرفَۃُ العین بلکہ اس سے بھی کم۔ اور اِس ہستی پر انسان کے یہ اِرادے اور یہ حوصلے۔ کہ گویا زمین اور آسمان میں سمانا نہیں چاہتا + پھر کیسے کیسے لوگ ہو گزرے ہیں۔ کہ اِس سرے سے اُس سرے تک ساری زمین کو ہلا مارا۔ اور مر گئے۔ تو کچھ بھی نہیں۔ ایک تودۂ خاک! آخر وہ کیا چیز تھی ؟ جو اُن میں سے نکل گئی + حیوانات۔ نباتات۔ لاکھوں قسم کی مخلوقات کا ایک چکّر سا بندھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمین سے پیدا ہوتے اور پھر اُسی میں فنا ہو جاتے ہیں۔ کسی کی عقل کام کرتی ہے ؟ کہ یہ کیا ہو رہا ہے ! اور کس غرض سے ہو رہا ہے ! +

(نذیر احمد)

کارخانۂ قدرت

(از ابن الوقت)

کسی کتاب میں نظر سے گزرا۔ کہ زمانۂ حال کا کوئی فلسفی خُردبین میں پانی کی ایک بوند کو دیکھ رہا تھا۔ سَو سے زیادہ طرح کے جاندار تو وہ اس ایک بوند میں بمشکل شمار کرسکا۔ آخر تھک کر بیٹھ رہا۔ ایک بوند میں اتنی مخلوقات ہو۔ تو تمام کُرۂ آب میں جو تین چوتھائی زمین کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ کتنی مخلوقات ہوگی؟ خدا ہی کو خبر ہے۔ پھر زمین کے گرداگرد ۴۵ میل کے دَل کا ہوائی کُرہ ہے۔ اور اُس میں بھی جان داروں کی (ایسی ہی یا اس سے زیادہ) کثرت ہے +

ہرچند کارخانۂ قدرتِ الٰہی کی عظمت و شان فہم بشر سے خارج ہے۔ مگر جس طریق پر میں نے اجمالاً بیان کیا۔ اگر کوئی آدمی مُتواتر اور متّصل مدّتوں تک غور کرتا رہے۔ تو ضرور اُس کے دل میں اپنی بے حقیقتی اور درماندگی اور بے وقعتی کا تیقّن پیدا ہوگا۔ جس کو میں دین داری کی بنیاد یا تمہید سمجھتا ہوں + اس کے بعد ذہن کو اِس طرف متوجہ کرنا چاہیئے۔ کہ اتنا بڑا کارخانہ با ایں عظمت کیسی عمدگی اور کیسے انضباط کے ساتھ چل رہا ہے۔ کہ عقل دنگ ہوتی ہے۔ اجرام فلکی کے اتنے اتنے بڑے بے شمار گولے۔ کہ خدا کی پناہ! اور خود زمین سب چکّر میں ہیں۔ خدا جانے کب سے؟ اور کیوں؟ اور کب تک؟ اور نہ آپس میں ٹکراتے ہیں۔ اور نہ بال برابر اپنی رفتار بدلتے ہیں۔

اب جو آدمیوں کو قاعدہ معلوم ہو گیا ہے۔ تو سیکڑوں ہزاروں برس پہلے سے پیشیں گوئی ہو سکتی ہے۔ کہ فلاں ستارہ فلاں وقت فلاں مقام پر ہوگا۔ اور وہیں ہوتا ہے۔ حساب میں اگر غلطی نہ ہو۔ تو منٹ اور سکنڈ کیسا! سکنڈ کے ہزارویں حصّے کی قدر بھی آگا پیچھا نہیں ہو سکتا +

یہاں روے زمین پر ایک بھنگے۔ ایک دانے۔ ایک پھل۔ ایک پنکھڑی۔ گھاس کے ایک ڈنٹھل۔ چھوٹی سے چھوٹی اور ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کو بھی نظرِ غور سے دیکھو۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر چیز کی کچھ نہ کچھ غرض و غایت ہے۔ جس کی تکمیل کا پورا پورا سامان اُس چیز میں موجود ہے۔ مثلاً ریگستانی علاقوں میں اونٹ پیدا کیا گیا ہے۔ تو اُس کے پانوٗ کے تلوے چوڑے اور اسفنج کی طرح پولے ہیں۔ کہ ریت میں نہ دھسیں۔ اُس کی گردن بہت لمبی ہے۔ تاکہ اونچے درختوں کے پتّے چر سکے۔ اُس کو ایک خاص طرح کا خانہ دار معدہ دیا گیا ہے۔ جس میں کئی کئی ہفتوں کے لئے کھانا پانی بھر لیتا ہے۔ کیونکہ جیسے ملک میں وہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہاں کئی کئی دن تک متواتر پانی چارے کا نہ ملنا کچھ تعجب نہیں۔ اِس کے علاوہ اُس کے پاس کوہان کا گودام ہے۔ کہ اگر اُس کو ایک عرصۂ خاص تک کھانا پینا کچھ بھی نہ ملے۔ تو کوہان کی چربی بدل مایتحلّل کا کام دے + ہرن وغیرہ جنگلی جانوروں کی ٹانگیں پتلی پتلی ہیں۔ تاکہ شکاری جانوروں سے بچنے کے لئے

پھُرتی کے ساتھ بھاگ سکیں + ہاتھی کے ایک سونڈ لٹک رہی ہے۔ جس سے وہ ہاتھ کا کام لیتا ہے + پرندوں کے جُثّے سبک ہیں۔ تاکہ ہَوا میں اُڑ سکیں + دریائی جانوروں کے پنجے کھال سے جڑے ہوئے ہیں۔ گویا کہ ہر ایک کے پاس قدرتی چپّو ہیں + گوشت خوار جانوروں کے پنجے اور دانت اُن کی غذا کے مناسب ہیں + نباتات میں پھل پھول کی حفاظت کے واسطے کانٹے ہیں۔ پوست ہیں۔ خول ہیں + سرد ملک کے جانوروں کی اُون بڑی بڑی اور گھنی ہے۔ کہ جاڑا نہ کھائیں + جتنے جاندار معرضِ تلف میں ہیں۔ اُن میں توالد و تناسُل کی کثرت ہے۔ تاکہ نسل معدوم نہ ہو۔ مثلاً ایک ایک مچھلی لاکھ سے زیادہ انڈے دیتی ہے + آدمی چونکہ ابقاے حیات کا سامان عقل کی مدد سے بہم پہُنچا سکتا ہے۔ سینگ اور پنجے اور اُون۔ اِس قسم کے سامان قدرتی اُس کو نہیں دئے گئے + جس ملک میں نباتات کی کثرت ہے۔ وہیں برسات بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ملک پانی کا محتاج ہے + اِنسان اگر اپنی ہی بناوٹ میں غور کرے۔ تو اُس کا ایک ایک رُواں صانعِ قدرت کی کمال دانشمندی اور عنایت پر گواہی دے رہا ہے۔ اُس کے جسم میں ایک چھوٹا اور آسان سا پُرزہ ہاتھ ہے۔ کہ دنیا میں جس قدر انسان کے تصرفات ہیں (اور انسان کی بساط پر خیال کرو۔ تو اُن تصرفات کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے) سب اِسی پرزے کے ہیں۔ اہلِ یورپ نے عقل کے زور سے بڑی بڑی عمدہ

کلیں بنائی ہیں۔ اِس میں شک نہیں۔ کہ اِن کلوں سے عقل انسانی کی قوّت بڑی شدّ و مد کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ مگر مجھ کو بھی دو چار کلوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک بکھیڑا ہے۔ کہ بیگھوں زمین پر پھیلا ہے۔ سیکڑوں پُرزے ہزارہا پیچ۔ بیلن۔ پہیئے۔ چرخیاں۔ کمانیاں۔ خدا جانے دنیا بھر کے کیا کیا سامان جمع کئے ہیں۔ تب کہیں جاکر وہ ایک مطلب حاصل ہوتا ہے۔ جس کے لئے کَل بنائی گئی ہے۔ یہ تو آدمی کی بنائی ہوئی کلوں کا حال ہے۔ اور ایک ادنیٰ سی کل خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ یہی آدمی کا ہاتھ۔ کہ ہزارہا قسم کے کام اِس سے نکلتے ہیں۔ اور ترکیب دیکھو تو ایسی سلیس اور مختصر۔ کہ ایک کفِ دست ہے۔ اور تین تین جوڑ کی پانچ اُنگلیاں۔ اللہ اللہ خیر صلّاح! +

اِنسان کے بدن میں ایک اَور ذرّے بھر کی چیز آنکھ ہے۔ اُس کی ساخت میں جو اندرونی حکمتیں ہیں۔ اُن سے بالاستیعاب ایک کتاب بن سکتی ہے۔ مگر خارج کی احتیاطوں کو تو دیکھو۔ کہ پہلے گویا ہڈیوں کا کاواک ہے۔ جس میں نگینے کی طرح آنکھ تعبیہ کی ہوئی ہے۔ اوپر بھوں کا چھجّے دار سائبان۔ سامنے پپوٹوں کا پردہ۔ پردے میں پلکوں کی جھالر۔ پھر پپوٹے کے اندر مَنافِذ ہیں۔ جن میں سے آئینۂ چشم کے صاف رکھنے کو ہمیشہ ایک خاص طرح کی رطوبت رِستی رہتی ہے۔ یہ وہی رطوبت ہے۔ جو زیادہ ہوکر آنسو بن جاتی ہے۔ جتنی دفعہ انسان پلک جھپکاتا ہے۔ گویا اُتنی ہی دفعہ آئینے پر پچارا پھرتا ہے۔ گرد اور دھوئیں

اور کنک کی صورت میں بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں۔ جس کے یہ معنی ہیں۔ کہ پچکارا کافی نہیں بلکہ آئینے کو دھونے کی ضرورت ہے۔*
میرا تو کیا مُنہ ہے۔ کہ موجوداتِ عالم میں جو اسرارِ حکمت مُضمر ہیں اُن کا ایک شمّہ بھی بیان کر سکوں۔ مگر میری غرض اسی قدر ہے۔ کہ دنیا کے کار خانے کو اس نظر سے دیکھنا چاہئے۔ کل میں نے آیت اللہ کا سبق سُنا۔ وہ عجائب قدرت پڑھتا ہے۔ کسی شخص نے نیچرل فلاسفی میں سے بعض بعض مضامین چھانٹ کر اُردو میں ترجمہ کر دئے ہیں۔ اُسی میں لکھا تھا۔ کہ مچھر کے مُنہ کے آگے جو ایک پتلی سونڈ سی ہوتی ہے۔ وہ حقیقت میں ایک نلوا ہے۔ اُس نلوے میں تین اوزار۔ ایک تو سوئی جس کو مچھر مَسام میں داخل کرتا ہے۔ ایک آری۔ کہ مَسام کو چوڑا کرنے کی ضرورت ہو۔ تو اُس سے کام لے۔ اور ایک سینگی جس کی راہ خون چوستا ہے۔ اُس میں اِتنی بات اَور بھی تھی۔ کہ اِس شکل خاص میں مچّھر کی مدّتِ حیات صرف تین دن کی ہے۔ ایک مقام پر تھا۔ کہ تیتری کے ایک پر میں کھپروں کی طرح تیس ہزار دیولیاں!۔ اِس طرح کی باتوں کو اگر انسان سرسری طور پر نہ سنے۔ جیسی کہ اُس کی عادت ہے۔ تو ہر ہر ذرّہ اس بات کی گواہی دیگا۔ کہ اُس کو کسی بڑے قدرت والے دانش مند۔ ہمہ داں۔ حاضر۔ ناظر۔ سمیع و بصیر نے کسی مصلحت سے جان بوجھ کر بنایا ہے۔ ممکن نہیں۔ کہ اِنسان صمیمِ قلب سے موجوداتِ عالم میں غور اور خوض

کرے۔ اور اُس کا دل اندر سے نہ بولنے لگے۔ کہ یہ اِتنا بڑا کارخانہ بایں عمدگی و انضباط خود بخود یا اتفاقیہ طور پر تو نہیں ہوگیا۔ کیونکہ واقعات اتفاقی کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ اُن میں قاعدہ کا کہاں پتا۔ اور اِنضباط کا کیا مذکور! اور قاعدہ اور انضباط بھی کیسا ہے کہ دنیا کی اِبتدا سے لے کر آج کی گھڑی تک تو اُس میں رتی برابر فرق پڑا نہیں +

(نذیر احمد)

شمس العلما مولوی شبلی نُعمانی

از سفر نامہ

قسطنطنیہ کے مختصر حالات

موجودہ حالت یہ ہے۔کہ آبنائے باسفورس کی شاخ۔جو دور تک چلی گئی ہے۔یہ شہر اُس کے دو کناروں پر آباد ہے۔اور اِس وجہ سے اُس کے دو حصّے بن گئے ہیں۔ایک حصّہ **استنبول** کہلاتا ہے۔اور تمام بڑی بڑی مسجدیں۔کتب خانے۔سلاطین کے مقبرے اِسی حصّہ میں ہیں۔مسلمانوں کی آبادی بھی کثرت سے یہیں ہے۔دوسرا حصّہ **پیرہ** سے شروع ہوتا ہے۔اور اُس کے اِنتہائی جانب پر **بشکطاس** وغیرہ واقع ہیں۔جہاں سلطان کا ایوانِ شاہی اور قصرِ عدالت ہے۔پیرہ کی دوسری طرف **غلطہ** ہے۔اور چونکہ تمام بڑے بڑے یورپین سوداگر اور سُفرائے سلطنت یہیں سکونت رکھتے ہیں۔اُس کو یورپین آبادی کہنا زیادہ مناسب ہے +

کہتے ہیں۔کہ دنیا کا کوئی شہر قسطنطنیہ کی برابر خوش منظر نہیں ہے۔اور حقیقت یہ ہے۔کہ منظر کے لحاظ سے اِس سے زیادہ خوش نما ہونا خیال میں بھی نہیں آتا۔اِسی لحاظ سے اُس کی بندرگاہ کو انگریزی میں گولڈن ہارن یعنی سُنہری سینگ کہتے ہیں۔کہیں کہیں عین دریا کے کنارے پر عمارتوں کا سلسلہ ہے اور دور تک چلا گیا ہے۔عمارتوں کے آگے جو

زمین ہے۔ وہ نہایت ہموار اور صاف ہے۔ اُس کی سطح سمندر کی سطح کے بالکل برابر ہے۔ اور وہاں عجیب خوش نما منظر پیدا ہو گیا ہے +

شہر کی وُسعتِ تمدُّن کا اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ خاص استنبول میں پانسو جامع مسجدیں۔ ایک سو اِکھتّر حمام۔ تین سو چونتیس سرائیں۔ ایک سو چونسٹھ مدارس قدیم۔ پانسو مدارس جدید۔ بارہ کالج۔ پینتالیس کتب خانے۔ تین سو پانچ خانقاہیں۔ اڑتالیس چھاپے خانے ہیں + کار و بار اور کثرتِ آمد و رفت کی یہ کیفیت ہے۔ کہ متعدّد ٹراموے گاڑیاں۔ بارہ دُخانی جہاز۔ زمین کے اندر کی ریل۔ معمولی ریلیں۔ جو ہر آدھ گھنٹے کے بعد چھوٹتی ہیں۔ ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ اور باوجود اِس کے سڑکوں پر پیادہ پا چلنے والوں کا اِس قدر ہجوم رہتا ہے۔ کہ ہر وقت میلہ سا معلوم ہوتا ہے۔ غلطہ اور استنبول کے درمیان میں جو پُل ہے۔ اُس پر سے گزرنے کا محصول فی شخص ایک پیسہ ہے۔ اُس کی روزانہ آمدنی پانچ چھ ہزار روپئے سے کم نہیں ہے +

قہوہ خانے نہایت کثرت سے ہیں۔ میرے تخمینہ میں چار پانچ ہزار سے کم نہ ہونگے۔ بعض بعض نہایت عظیم الشان ہیں۔ جن کی عمارتیں شاہی محل معلوم ہوتی ہیں۔ قہوہ خانوں میں ہمیشہ ہر قسم کے شربت اور چاے و قہوہ وغیرہ مہیّا رہتا ہے۔ اکثر قہوہ خانے دریا کے ساحل پر اور بعض عین دریا میں ہیں۔ جن کے لئے لکڑی کا پُل بنا ہوا ہے۔ قہوہ خانوں میں روزانہ اخبارات بھی موجود رہتے ہیں۔ لوگ قہوہ پیتے جاتے ہیں۔ اور

اخبارات دیکھتے جاتے ہیں۔ قسطنطنیہ بلکہ ان تمام ممالک میں قہوہ خانے ضروریات زندگی میں محسُوب ہیں۔ میرے عرب احباب جب مجھ سے سُنتے تھے۔ کہ ہندوستان میں اس کا رواج نہیں۔ تو تعجّب سے کہتے تھے۔ "وہاں لوگ جی کیونکر بہلاتے ہیں" ان ملکوں میں دوستوں کے مِلنے جُلنے اور گرمی صحبت کے موقعے یہی قہوہ خانے ہیں +

افسوس ہے۔ کہ ہندوستانیوں کو ان باتوں کا ذوق نہیں۔ وہ جانتے ہی نہیں۔ کہ اِس قسم کی عام صحبتیں زندگی کی دلچسپی کے لئے کس قدر ضروری ہیں۔ اور طبیعت کی شگفتگی پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے۔ دوستانہ مجلسیں ہمارے ہاں بھی ہیں۔ جس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ کسی دوست کے مکان پر دو چار احباب کبھی کبھی مل بیٹھتے ہیں۔ لیکن اس طریقہ میں دو بڑے نقص ہیں۔ اوّل تو تفریح کے جلسے پُرفضا مقامات میں ہونے چاہئیں۔ کہ تازہ اور لطیف ہوا کی وجہ سے صحت بدنی کو فائدہ پہنچے۔ دوسرے سخت خرابی یہ ہے۔ چونکہ یہ جلسے پرایوٹ جلسے ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن میں غیبت۔ شکایت اور اِس قسم کی لغویات کے سوا اَور کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ بخلاف قہوہ خانوں کے جہاں مجمعِ عام کی وجہ سے اِس قسم کی باتوں کا موقع نہیں مل سکتا۔ قسطنطنیہ اور مصر میں مَیں ہمیشہ شام کے وقت دوستوں کے ساتھ قہوہ خانوں میں بیٹھا کرتا تھا۔ لیکن میں نے کبھی اِس قسم کے تذکرے نہیں سُنے۔ تفریح اور بذلہ سنجی کے سوا وہاں کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ ہو سکتا تھا +

قسطنطنیہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے۔کہ اگر کسی کو یورپین اور ایشیائی تمدّن کی تصویر ایک مرقع میں دیکھنی ہو۔تو یہاں دیکھ سکتا ہے۔کتب فروشوں کی دُکانوں کی سیر کرو۔تو ایک طرف ایک نہایت وسیع دُکان ہے۔سنگ رُخام کا فرش ہے۔شیشہ کی نہایت خوبصورت الماریاں ہیں۔کتابیں جس قدر ہیں۔مُجلّد۔اور جلدیں بھی معمولی نہیں۔بلکہ عموماً مُطلّا و مُذہّب۔مالک دُکان میز کرسی لگائے بیٹھا ہے۔دو تین کم سن خوش لباس لڑکے اِدھر اُدھر کام میں لگے ہیں۔تم نے دُکان میں قدم رکھا۔ایک لڑکے نے کرسی لاکر سامنے رکھدی۔اور کتابوں کی فہرست حوالہ کی۔قیمت فہرست میں مذکور ہے۔اور اُس میں کمی بیشی کا احتمال نہیں ✦

دوسری طرف سڑک کے کنارے چبوتروں پر کتابوں کا بے قاعدہ ڈھیر لگا ہے۔زمین کا فرش اور وہ بھی اِس قدر مختصر کہ تین چار آدمی سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔قیمت چُکانے میں گھنٹوں کا عرصہ درکار ہے ✦

اِسی طرح ہر پیشہ و صنعت کی دُکانیں۔دونوں نمونہ کی موجود ہیں۔عام صفائی اور زیب و زینت کا بھی یہی حال ہے۔**غلطہ** کو دیکھو۔تو یورپ کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔دُکانیں بلند اور آراستہ۔سڑکیں وسیع اور ہموار۔کیچڑ اور نجاست کا کہیں نام نہیں۔بخلاف اِس کے اِستنبول میں جہاں زیادہ تر مسلمانوں کی آبادی ہے۔اکثر سڑکیں ناصاف اور بعض بعض جگہ اِس قدر ناہموار کہ چلنا مشکل ✦

اِس شہر میں آکر ایک سیّاح کے دل میں غالباً جو خیال سب سے

پہلے آتا ہوگا۔ وہ یہ ہوگا۔ کہ اِس عظیم الشان دار السلطنت کے دو حصّوں میں اِس قدر اِختلاف حالت کیوں ہے؟ چنانچہ میرے دل میں سب سے پہلے یہی خیال آیا۔ میں نے اس کے متعلق کچھ بحث و تفتیش کی۔ باشندوں کے اِختلاف حالت کا سبب تو میں نے آسانی سے معلوم کر لیا۔ یعنی مسلمانوں کا اِفلاس اور دوسری قوموں کا تموّل۔ لیکن سڑکوں اور گزر گاہوں کی ناہمواری و غلاظت کا بظاہر یہ سبب قرار نہیں پا سکتا تھا۔ اِس لئے میں نے ایک معزز ترکی افسر یعنی حسین حبیب آفندی پولیس کمشنر سے دریافت کیا۔ اُنھوں نے کہا۔ کہ ہماری میونسپلٹی کے ٹیکس بہت کم ہیں۔ بہت سی چیزیں محصول سے مُعاف ہیں۔ لیکن غلطہ میں یورپین سوداگر خود اپنی خواہش سے بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ اِس لئے میونسپلٹی اُن رقموں کو فیاضی سے صرف کر سکتی ہے۔ مجھے خیال ہوا۔ کہ یہ وہی غلطہ ہے۔ جس کی نسبت ابن بطوطہ نے نجاست اور میلے پن کی سخت شکایت کی ہے۔ یا اب اُن کو صفائی و پاکیزگی کا یہ اہتمام ہے۔ کہ اُس کے لئے بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ صفائی اور خوش سلیقگی آج کل یورپ کا خمیر بن گیا ہے۔

یہاں کی عمارتیں ہندوستان کی عمارتوں سے بالکل جُدا وضع کی ہیں۔ مکانات عموماً سہ منزلہ۔ چو منزلہ ہیں۔ صحن مطلق نہیں ہوتا۔ عمارتیں تمام لکڑی کی ہیں۔ بڑے بڑے اُمرا اور پاشاؤں کے محل بھی لکڑی ہی کے ہیں۔ اور یہی سبب ہے۔ کہ یہاں اکثر آگ لگتی ہے۔ کوئی مہینہ بلکہ ہفتہ

خالی نہیں جاتا۔ کہ دو چار گھر آگ سے جلکر تباہ نہ ہوں۔ اور کبھی کبھی تو محلّے کے محلّے جلکر خاک سیاہ ہو جاتے ہیں۔ آگ بُجھانے کے لئے سلطنت کی طرف سے نہایت اہتمام ہے۔ کئی سو آدمی خاص اس کام پر مقرر ہیں۔ ایک نہایت بلند مُنارہ بنا ہوا ہے۔ جس پر چند ملازم ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ کہ جس وقت کہیں آگ لگتی دیکھیں۔ فوراً خبر کریں۔ اس قسم کے اَور بھی چھوٹے چھوٹے منارے جابجا بنے ہوئے ہیں۔ جس وقت کہیں آگ لگتی ہے۔ فوراً توپیں سر ہوتی ہیں۔ اور شہر کے ہر حصّے سے آگ بُجھانے والے ملازم تمام آلات کے ساتھ موقع پر پُہنچ جاتے ہیں۔ اُن کو حکم ہے کہ بے تحاشا دوڑتے جائیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی راہ چلتا اُن کی جھپٹ میں آکر پس جائے۔ تو کچھ الزام نہیں۔ میں نے لوگوں سے دریافت کیا۔ کہ پتّھر کی عمارتیں کیوں نہیں بنتیں۔ معلوم ہوا۔ کہ سردی کے موسم میں سخت تکلیف ہوتی ہے اور تندرستی کو نقصان پُہنچتا ہے +

آب و ہوا یہاں کی نہایت عمدہ ہے۔ جاڑوں میں سخت سردی پڑتی ہے اور کبھی کبھی برف بھی گرتی ہے۔ گرمیوں کا موسم جس کا مجھ کو خود تجربہ ہوا۔ اِس قدر خوش گوار ہے۔ کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے۔ کہ ہمارے یہاں کے اُمرا شملہ اور نینی تال کی بجائے قسطنطنیہ کا سفر کیوں نہیں کرتے! پانی پہاڑ سے آتا ہے۔ اور نہایت ہاضم اور خوش گوار ہے +

(شبلی نعمانی)

مصر کی قدیم یادگاریں

آثار قدیمہ کے لحاظ سے کوئی شہر اس شہر کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ سچ یہ ہے۔کہ یہاں کی ایک ایک ٹھیکری قدامت کی تاریخ ہے۔سوادِ شہر کے ویرانوں میں اِس وقت تک سیکڑوں خزف ریزے ملتے ہیں۔ جن پر کئی کئی ہزار سال قبل کے حروف و نقوش کندہ ہیں۔ مجھ کو اِتنا وقت بلکہ سچ یہ ہے۔کہ اِتنی ہمت کہاں تھی۔کہ تمام قدیم یادگاروں کی سیر کرتا البتہ چند مشہور مقامات دیکھے اور اُنہیں کے حال کے لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں+

اَھرام۔یہ وہ قدیم مینار ہیں۔جن کی نسبت عام روایت ہے۔کہ طوفانِ نوحؑ سے پہلے موجود تھے۔اور اس قدر تو قطعی طور سے ثابت ہے۔کہ یونان کی علمی ترقی سے ان کی عمر زیادہ ہے۔کیونکہ جالینوس نے اپنی تصنیف میں اس کا ذکر کیا ہے۔یہ مینار نہایت کثرت سے تھے۔ یعنی دو دن کی مسافت میں پھیلے ہوئے تھے۔صلاح الدین کے زمانہ میں اکثر ڈھا دئے گئے۔ ان میں سے جو باقی رہ گئے ہیں۔اور جن پر خاص طور سے اَھرام کا اطلاق ہوتا ہے۔صرف تین ہیں۔ جو سب سے بڑا ہے۔ اُس کی لمبائی چار سو اَسّی فیٹ یعنی قطب صاحب کی لاٹ سے دُگنی ہے۔نیچے کے چبوترہ کا ہر ضلع سات سو چونسٹھ فیٹ ہے۔مینار کا مکعب آٹھ کروڑ نوّے لاکھ فیٹ ہے۔اور وزن اَڑسٹھ لاکھ چالیس ہزار ٹن۔ اِس کی تعمیر میں ایک لاکھ آدمی بیس برس تک کام کرتے رہے۔جڑ میں

تیس تیس فیٹ لمبی اور پانچ پانچ فیٹ چوڑی پتّھر کی چٹانیں ہیں۔اور چوٹی پر جو چھوٹی سے چھوٹی ہیں۔آٹھ فیٹ کی ہیں +

اُس کی شکل یہ ہے۔کہ ایک نہایت وسیع مربع چبوترہ ہے۔اُس پر ہر طرف سے کسی قدر سطح چھوڑکر دوسرا چبوترہ ہے۔اسی طرح چوٹی تک اوپر تلے چبوترے ہیں۔اور ان چبوتروں کے بتدریج چھوٹے ہوتے جانے سے زینوں کی شکل پیدا ہو گئی ہے۔تعجب یہ ہے۔کہ پتھروں کو اس طرح وصل کیا ہے۔کہ جوڑ یا درز کا معلوم ہونا تو ایک طرف۔چونہ یا مصالح کا بھی اثر نہیں معلوم ہوتا۔اس پر استحکام کا یہ حال ہے۔کہ کئی ہزار برس ہو چکے اور جوڑوں میں بال برابر فصل نہیں پیدا ہوا ہے +

ان میناروں کو دیکھکر خواہ مخواہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔کہ جرّ ثقیل کا فن قدیم زمانہ میں موجود تھا۔کیونکہ اس قدر بڑے بڑے پتّھر اتنی بلندی پر جرّ ثقیل کے بغیر چڑھائے نہیں جا سکتے۔اور اگر اس ایجاد کو زمانۂ حال کے ساتھ مخصوص سمجھیں۔تو جرّ ثقیل سے بھی بڑھکر کسی عجیب صنعت کا اعتراف کرنا پڑیگا +

ان میناروں میں سے ایک جو سب سے چھوٹا ہے۔کسی قدر خراب ہو گیا ہے۔جس کی کیفیت یہ ہے۔کہ ۵۹۳ھ ہجری میں ملک العزیز (پسر سلطان صلاح الدین) نے بعض احمقوں کی ترغیب سے اس کو ڈھانا چاہا۔چنانچہ دربار کے چند معزّز افسر اور بہت سے نقب زن اور سنگتراش اور مزدور اس کام پر مامور ہوئے۔آٹھ مہینے تک برابر کام

جاری رہا اور نہایت سخت کوششیں عمل میں آئیں۔ ہزاروں لاکھوں روپئے برباد کر دئے گئے۔ لیکن بجز اس کے کہ اوپر کی استرکاری خراب ہوئی۔ یا کہیں کہیں سے ایک آدھ پتھر اُکھڑ گیا اَور کچھ نتیجہ نہیں ہوا۔ مجبور ہوکر ملک العزیز نے یہ اِرادہ چھوڑ دیا +

اہرام کے قریب ایک بہت بڑا بت ہے۔ جس کو یہاں کے لوگ **ابوالہول** کہتے ہیں۔ اُس کا سارا دھڑ زمین کے اندر ہے۔ گردن اور سر اور دونوں ہاتھ کھُلے ہوے ہیں۔ چہرہ پر کسی قسم کا سرخ روغن ملا ہے۔ جس کی آب اِس وقت تک قائمُ ہے۔ اِن اعضا کی مناسبت سے اندازہ کیا جاتا ہے۔ کہ پورا قد ساٹھ ستّر گز سے کم نہ ہوگا۔ باوجود اِس غیر معمولی درازی کے تمام اعضا ناک کان وغیرہ اِس ترتیب اور مناسبت سے بنائے ہیں۔ کہ اعضا کے باہمی تناسب میں بال برابر کا فرق نہیں۔ عبد اللطیف بغدادی سے کسی شخص نے پوچھا تھا۔ کہ آپ نے دنیا میں سب سے عجیب تر کیا چیز دیکھی ؟ اُس نے کہا کہ "ابو الہول کے اعضا کا تناسب"۔ کیونکہ عالم قدرت میں جس چیز کا نمونہ موجود نہیں۔ اُس میں ایسا تناسب قائمُ رکھنا آدمی کا کام نہیں +

(شبلی نعمانی)

مولوی عبد الحلیم صاحب شررؔ لکھنوی

بزمِ قدرت

دنیا کی سب محفلیں تغیرات زمانہ سے درہم و برہم ہو جاتی ہیں۔ مگر خدا کی مرتب کی ہوئی محفل۔ جس میں انقلابات عالم سے ہر روز ایک نیا لطف پیدا ہوتا رہتا ہے۔ ہمیشہ آباد رہی اور یونہیں قیامت تک جمی رہے گی۔ یہ وہ محفل ہے۔ جس کی رونق کسی کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتی۔ وہ پُر غم واقعات اور وہ حسرت بھرے سانحے جن سے ہماری محفلیں درہم و برہم ہو جایا کرتی ہیں۔ اُن سے بزمِ قدرت کی رونق اَوْر دو بالا ہو جاتی ہے۔ ہماری صحبت کا کوئی آشنا حرماں نصیبی میں ہم سے بچھڑ کے مبتلائے دشت غربت ہو جاتا ہے۔ تو برسوں ہماری انجمنیں سونی پڑی رہتی ہیں۔ ہمارے عشرت کدوں کا کوئی زندہ دل نذر اجل ہو جاتا ہے۔ تو سالہا سال کے لئے وہ ماتم کدے ہو جاتے ہیں۔ مگر جب ذرا نظر کو وسیع کرو۔ اور خاص صدمات کا خیال چھوڑ کے عالم کو عام نظر سے دیکھو۔ تو اُس کی چہل پہل ویسی ہی رہتی ہے۔ بلکہ نئی نسل کے دو چار پُر جوش زندہ دل ایسے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کہ دنیا کی دلچسپیاں ایک درجہ اَوْر ترقی کر جاتی ہیں۔ ایک شاعر کا قول ہے

دنیا کے جو مزے ہیں۔ ہرگز یہ کم نہ ہوں گے
چرچے یہی رہیں گے۔ افسوس! ہم نہ ہوں گے

جس نے کہا ہے بہت خوب کہا ہے۔ بزم قدرت ہمیشہ یونہیں دلچسپیوں سے آباد رہے گی۔ ہاں ہم نہ ہونگے۔ اور ہماری جگہ زمانہ ایسے اچھے نِعمَ البدل لاکے بٹھا دیگا۔ کہ ہماری باتیں محفل والوں کو پھیکی اور بے مزہ معلوم ہونے لگیں گی ٭

الغرض یہ محفل کبھی خالی نہیں رہی۔ کوئی نہ کوئی ضرور رہا۔ جو اِس بزم کی رونق کو ترقی دیتا رہا۔ اِسی مقام سے یہ نازک مسئلہ ثابت کیا جاتا ہے۔ کہ زمانہ کی عام رفتار ترقی ہے۔ ایک قوم آگے بڑھتی اور دوسری پیچھے ہٹتی ہے۔ تنزّل پذیر قوم کے لوگ اپنے مقام پر جب اطمینان سے بیٹھتے ہیں۔ زمانہ اور ملک کی شکایتوں کا دفتر کھول دیتے ہیں۔ اور اُن کو دعویٰ ہوتا ہے۔ کہ زمانہ تنزّل پر ہے۔ مگر اصل پوچھئے۔ تو تنزّل صرف اُن کی غفلتوں اور راحت طلبیوں کا نتیجہ ہے۔ دنیا اپنی عام رفتار میں ترقی ہی کی طرف جا رہی ہے ٭

اے وہ لوگو! جو شکایت زمانہ میں زندگی کی قیمتی گھڑیاں فضول گزران رہے ہو۔ ذرا بزم قدرت کو دیکھو تو کس قدر دل کش اور نظر فریب واقع ہوئی ہے۔ تمھارے دل میں وہ مذاق ہی نہیں پیدا۔ کہ ان چیزوں کی قدر کر سکو۔ یہ وہ چیزیں ہیں۔ کہ انسانی جوش کو بڑھاتی ہیں۔ اور طبیعت میں وہ مُفید حوصلے پیدا کرتی ہیں۔ جن سے ہمیشہ نتیجے پیدا ہوئے اور پیدا ہونگے۔ اندھیری رات میں آسمان نے اپنے شب زندہ دار دوستوں کی محفل آراستہ کی ہے۔ تارے کھلے ہوئے ہیں۔ اور اپنی

بے ترتیبی اور بے نظمی پر بھی عجب بہار دکھا رہے ہیں۔ دیکھو ان پیارے خوش نما تاروں کی صورت پر کیسی زندہ دلی اور کیسی تری و تازگی پائی جاتی ہے؟ پھر یکایک مہتاب کا ایسا حسین اور نورانی مہمان مشرق کی طرف سے نمودار ہوا۔ اور یہ گورے گورے تارے اپنی بے فروغی پر افسوس کرکے غائب ہونے لگے۔ ماہتاب آسمان کے نیلگوں اطلسی دامن میں کھیلتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ اگرچہ ہماری طرح دل داغدار لیکے آیا تھا۔ لیکن خوش خوش آیا۔ اور ہمارے غربت کدوں کو روشن کرکے بزم قدرت میں نہایت لطیف اور خوش گوار دل چسپیاں پیدا کرکے خوشی خوشی صحن فلک کی سیر کرتا ہوا مغرب کی طرف گیا اور غائب ہوگیا + ابھی آسمان کو اُس مہمان کا انتظار تھا۔ جس سے نظام عالم کا سارا کار و بار چل رہا ہے۔ اور جس کی روشنی ہماری زندگیوں کی جان اور ہماری ترقیوں کا ذریعہ ہے۔ آفتاب بڑی آب و تاب سے ظاہر ہوا۔ رات کا خوبصورت اور ہم صحبت چاند اپنے اُترے ہوئے چہرہ کو چھپاکے غائب ہوگیا۔ اور آسمان کا اسٹیج بزم قدرت کے دلفریب ایکٹروں سے خالی ہوگیا +

خواب شب کا مزا اُٹھانے والوں کی آنکھیں کھُل کھُل کے اُفق مشرق کی طرف متوجّہ ہوئی ہیں۔ آفتاب کی شعاعیں آسمان کے دَور پر چڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اِس کے ساتھ مرغانِ سحر کے نغمہ کی آواز کانوں میں آئی ہے۔ اور آنکھیں مل کے دیکھا ہے۔ تو ہماری نظر کی

خیرگی نہ تھی۔ شمع حقیقت میں جھلملا رہی ہے۔ یک بیک وفورِ طرب نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ گھنٹے بجے۔ چڑیاں چہچہائیں۔ موذّنوں نے اذانیں دیں۔ اور تمام جانوروں کی مختلف آوازوں نے ملکر ایک ایسا ہمہمہ پیدا کردیا ہے۔ کہ نیچر کی رفتار میں بھی تیزی پیدا ہوگئی۔ باغ نیچر کے چابکدست کاریگر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ نسیمِ سحر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی آئی اور ضابط و متین غنچوں کے پہلو گُدگُدانے لگی۔ الغرض قدرت نے اپنی پوری بہار کا نمونہ آشکارا کر دیا۔ (عبد الحلیم شرر)

خان بہادر۔ شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ

وارن ہیسٹنگز کے اخلاق و عادات

شاید کوئی اَور دوسرا مدبّر و منتظم ملکی ایسا گزرا ہو۔ کہ جس کی تفضیح اور ہجو اس مبالغہ سے اور تعریف اِس شدّ و مد سے ہوئی ہو۔ اور اُس کی ساری زندگی کے افعال اور اعمال کی تحقیقات ایسی شہادت تحریری سے ہوئی ہو۔ مگر اُس کی نسبت لکھنے والے طرف دار اور متعصّب تھے۔ اگر نظر انصاف سے دیکھیے۔ تو اُس میں یہ بھلائیاں اور بُرائیاں معلوم ہونگی۔ جو ہم نیچے لکھتے ہیں۔ اُس کی فطانت اور فراست و ذہانت کے سب دوست دشمن قائل ہیں۔ کوئی اِس میں شبہ نہیں کرتا۔ کہ وہ بیدار مغز اور ہوشیار دل ایسا تھا۔ کہ اُمور خطیر اور

معاملات عظیم کے اِنصرام اور سرانجام کرنے کی اُس میں قابلیت اور لیاقت تھی۔ برسوں تک اُس نے ایک سلطنتِ بزرگ اور مملکت عظیم کا نظم و نسق کیا۔ سوائے ذہین اور قابل ہونے کے وہ محنت شعار اور جفاکش پرلے درجے کا تھا۔ کاہلی اُس سے کروڑوں کوس دور رہتی تھی۔ اُس کے جانشین جو ہوئے۔ اُن میں دو چار قابلیت اور لیاقت میں تو ہم پلہ ہوئے۔ مگر محنت و مشقت و کار گزاری میں کہیں اُس سے ہلکے تھے۔ یہی پہلا عالی دماغ تھا۔ جس نے یہ سوچا۔ کہ انگریزی گورنمنٹ سب سے علیحدہ رہ کر قائم نہیں رہ سکتی۔ اُس کے لئے ضرور ہے۔ کہ وہ اَور ہندوستانی رئیسوں سے آمیزش اور سازش کرے۔ یہی باب فتح و نصرت کی کُنجی ہے۔ یہی وہ روشن عقل تھا۔ کہ اُس شاہراہ پر انگریزی گورنمنٹ کو رستہ دکھایا۔ جس پر چلنے سے وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئی۔ گو یہ خیالات اُس وقت انگلستان میں عام پسند نہ تھے۔ مگر بُری بھلی طرح سے تجربہ ہوکر آخرکار وہی صحیح ثابت ہوگئے +

اُس نے انگریزی صوبوں کے حُسنِ انتظام میں اپنی عقل و ذہن کو بہت خرچ کیا۔ انقلابوں کے طوفان نے سارے ملک میں اندھیر مچا رکھا تھا۔ کسی سلطنت کا چراغ روشن نہ رکھا تھا۔ شمع افسردہ کی طرح سب میں دُھواں نکل رہا تھا۔ مالی اور دیوانی عدالتوں کا بہت بُرا حال تھا۔ وہ نام کی عدالتیں تھیں۔ حقیقت میں اُن کے طُفیل وہ ظُلم و ستم ہوتے تھے۔ کہ قلم لِکھ نہیں سکتا۔ اگر زمیندار تھا۔ تو ادائے مالگزاری کے لئے

سر اُس کا گنجہ بنایا جاتا تھا۔ اگر ساہوکار تھا۔ تو وہ شکنجے میں پھنسا ہوا تھا۔ غرض سارے زمانے کی عافیت تنگ تھی۔ اُس نے ان سب عدالتوں کی اصلاح کی۔ گو اِن کو اُس نے درجۂ کمال پر نہیں پہنچایا۔ اور نہ اِن کو اچھا بنایا۔ مگر وہ ایک بنیاد اُن کی ایسی ڈال گیا۔ کہ پھر اُس پر اَوروں کو ردّے لگاکر عمارت بنانی آسان ہوگئی۔ کوئی حکومت کا کارخانہ ایسا نہ تھا۔ کہ جس کی طرف اُس نے توجّہ نہ کی ہو۔ اور اُن میں بہت سی باتوں کا موجد نہ ہو +

اُس نے اپنی سرکار کی ہوا خواہی اور خیراندیشی میں بھی کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ مگر اس میں اُس نے اخلاق کی نیکی پر خیال نہیں کیا۔ جس وقت سرکار نے روپیہ مانگا۔ تو اُس کے سرانجام کرنے میں کسی بات کا آگا پیچھا نہیں سوچا۔ از راہِ ظلم و تعدی جو دولت کا سامان کیا۔ اہلِ انگلستان نے اُس کو سر بے سامانی سمجھا۔ اُس کی طبیعت کا خمیر ایسا تھا۔ کہ وہ عدالت اور صداقت کو ضرورت کے وقت کچھ چیز نہیں سمجھتا تھا اور مروّت و فتوّت کو انسانیت میں داخل نہیں جانتا تھا۔ "گر ضرورت بود روا باشد" پر عمل تھا۔ وہ خود رائی کے سبب بر خود غلط اتنا تھا۔ کہ اپنے سامنے افلاطون کی بھی حقیقت نہیں جانتا تھا۔ ہر کام اُس کا ایک رازِ سربستہ اور سرِّ پوشیدہ تھا۔ کسی کام کی اصل و حقیقت کھُلنے ہی نہیں دیتا تھا۔ گو اُس کے ظاہر ہوجانے سے نقصان نہ ہو۔ وجہ اس کی یہ تھی۔ کہ وہ ہر کام کو بڑے پیچ پاچ سے کرتا تھا۔ غرض اُس میں جو

خوبیاں تھیں۔وہ تحسین کے قابل تھیں۔ اور جو بُرائیاں تھیں۔وہ نفرین کے لائق۔یوں سمجھنا چاہیئے۔کہ رعایا پروری۔سپاہ کی دلداری۔لوگوں کو اپنا کرلینا۔رفاہیت عباد اور معمورئ بلاد کا خیال یہ سب خوبیاں اُس میں ایسی تھیں۔کہ وہ ایک طوطئے خوش رنگ کی طرح خوش نما معلوم ہوتی تھیں۔مگر اپنی سرکار کی نمک شناسی کے سبب سے اُس کی گنجینہ آمائی۔دولت افزائی ایسی ایک بلّی اُس میں تھی۔کہ وہ اِس طوطئے خوش رنگ کو نوچے کھاتی تھی۔مگر اس بلّی کے بھنبوڑنے کے لئے اُس کے پاس ایک کتّا بھی موجود تھا۔جو اُس کی خود پرستی و خود رائی تھی۔ غرض یہ فضائل اور رذائل اُس میں کام کر رہے تھے۔جو ایک بڑے بند مکان میں طوطی اور بلّی اور کتّا کام کریں۔ہیسٹنگز صاحب کی سب سے زیادہ تعریف اِس بات میں تھی۔کہ اُس نے سارے کارخانوں اور کاموں کے لئے خود ہی مقدّمات کو ترتیب دیا اور اُس بات کو سرانجام کیا۔جب وہ ولایت سے ہندوستان میں آیا۔تو طفلِ مکتب تھا۔نوکری ملی تو تجارت کے کارخانے میں۔کبھی اُس کو اہلِ علم اور منتظمانِ ملکی کی صحبت بھی مُیسّر نہ ہوئی۔جتنے اُس کے یہاں جلیس و انیس تھے۔اُن میں کوئی اُس سے زیادہ صاحبِ لیاقت نہ تھا کہ اُس کی لیاقت کو بڑھاتا۔ بلکہ اُس کو خود اُستاد بنکر اور سب کو لیاقت کا سبق پڑھانا پڑا۔ وہ سب کا رہنما تھا اور اُس کا رہنما فقط اُس کی عقل و دانش کا نور تھا۔

(محمد ذکاء اللہ)

ادب

ادب کے معنی اُس ریاضتِ محمودہ اور کوشش و سعی کے ہیں۔ جس سے کسبِ فضیلت ہو۔ ہر چیز کی حد کی نگہداشت کو اور ہر فعلِ محمودہ کی تعظیم کو بھی ادب کہتے ہیں +

تو اپنے نفس کو وہ ادب سکھا۔ کہ بے ادب اُسے دیکھکر با ادب ہو جائیں۔ جو ادب سکھانے کا ذوق رکھتا ہے۔ وہ بے ادبوں کو اپنا ہی سا بنا لیتا ہے۔ جیسے آہوے وحشی جو گھر میں دانہ کھاتا ہے۔ وہ اور آہوؤں کو پکڑ لاتا ہے + جو اپنے اخلاق کی بنیاد ادب پر رکھتا ہے۔ اُس کا فکر اُستاد ہو جاتا ہے۔ بزرگی کی جڑ ادب سے مُستحکم ہوتی ہے + تو لالہ و گُل کی طرح تھوڑا سا خندہ کر۔ کہ سب کو مطبوع ہو۔ نہ یہ کہ ایسے قہقہے لگائے۔ کہ سب کو بیہودہ معلوم ہوں۔ بے خرد جس کو مزاح کہتے ہیں۔ وہ خرد مندوں کے نزدیک تبرد و سلاح ہے۔ اگر تمھاری ڈاڑھی کوّوں کے پروں کی سی سیاہ ہو۔ تو بڈھوں کی بگلا سی سفید ڈاڑھی کی ہنسی نہ اُڑاؤ۔ اگر تم سمن عارض اور گُلعذار ہو۔ تو زنگی کے سامنے آئینہ رکھ کر اُسے نہ چڑاؤ۔ کیونکہ کوئی بد صورت دنیا میں بے مصلحت نہیں ہوتا۔ ایک چینی جس کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ ایک زنگی پر ہنسا تو زنگی نے جواب دیا۔ کہ میرا ایک نقطہ تیرے چہرے کے لئے زیب ہے اور تیرا ایک نقطہ میرے لئے ایک عیب ہے۔ تجھے چاہئے۔ کہ جو تیرا

عیب بیں ہو- تو اُس کا ہنر دیکھ- جو تجھے زہر دے- تو اُس کو نبات دے- جو تجھے مارے- تو اُسے آبِ حیات پلا- تاکہ تیری عقل سلامت پسند ہو- اور تیرے نام کا خُطبہ اخلاق میں بآواز بلند پڑھا جائے- خدا سے توفیقِ ادب کی دعا مانگ- کیونکہ ادب کے بغیر لطفِ رب سے آدمی محروم رہتا ہے- بے ادب اپنے ہی لئے بُرا نہیں ہوتا- بلکہ اَوروں کے لئے بھی بُرا نمونہ بنتا ہے- ادب اِنسان کو معصوم بناتا ہے- گُستاخی اور بے باکی غموں کا ہجوم رکھتی ہے + (محمدؐ ذکاء اللہ)

حیا

حیا بھی طرح طرح کی ہوتی ہے اور بے حیائی بھی قسم قسم کی- سب سے زیادہ سخت بے حیائی اپنی محبّت میں اندھا ہونا ہے- جس میں اکثر انسان مبتلا ہیں- ایک شخص جو سرشت انسانی سے بڑا ماہر ہے- وہ یہ کہتا ہے- کہ آدمی اپنے سے سب کے بعد محبت کرے- مگر دنیا میں بہت سے آدمی ایسے دیکھنے میں آتے ہیں- کہ وہ سب سے پہلے اپنے سے محبت کرتے ہیں- وہ اپنی ذات میں اُن صفات کا یقین کرتے ہیں- جو درحقیقت اُن میں نہیں ہوتیں- اور اپنی ذات کی قدر و منزلت و قیمت میں مبالغہ کرتے ہیں- یہی سخت عیب ہے- جس سے انسان- جو اپنے سے آپ دھوکا کھاتا ہے- اور ذلت اُٹھاتا ہے- خلق کی نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے- جب آدمی خود ستائی کرتا ہے- اور اِس طرح اپنے

تئیں دکھانا چاہتا ہے۔ جس سے معلوم ہو۔ کہ وہ کوئی بڑی قابلیت و قدر و منزلت کا آدمی ہے۔ تو ضرور اُس کی ہنسی ہوتی ہے۔ ہم کو چاہئے کہ جب کوئی دوسرا شخص ہماری تعریف کرے۔ تو اُس کو حیا و شرم کے ساتھ قبول کریں۔ ظاہر اور باطن دونوں میں فروتنی اور عجز و انکسار اختیار کرنا چاہئے۔ جب آدمی اپنی نیک صفات کو۔ جو حقیقت میں اُس کے اندر ہیں۔ نمود کے ساتھ دکھائے گا۔ تو شیخی کرکری ہو جائیگی +

غرور کرنا بڑی بے حیائی ہے۔ مغرور بڑا بے حیا ہوتا ہے۔ مغرور اپنی نخوت کے زور سے مصیبتوں کا مقابلہ عبث کرتا ہے۔ وہ اپنے دُگنے زور سے اپنے سرکش دل کے ٹکڑے کرتا ہے۔ نرم پودا ہوا کے جھوکوں کے آگے سر جُھکاتا ہے۔ اور اُس کے تمام زور کو اپنے سے دور کر دیتا ہے اور خود قائم رہتا ہے۔ ایسے ہی فروتن۔ متواضع۔ منکسر اپنے عجز و انکسار سے بلاؤں کو سر پر سے ٹال دیتا ہے +

سفلے کم ظرف نا شائستہ اپنی اصلی لیاقتوں کی شیخیاں بگھارا کرتے ہیں۔ سچے مہذّب اور شائستہ اپنے عجز و ناتوانی کو ظاہر کیا کرتے ہیں۔ علم میں جو لوگ تھوڑی لیاقت رکھتے ہیں۔ وہی اپنے عالم ہونے کے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ مگر حقیقت میں جو عالم علم دستگاہ اور حقیقت آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آگے بہ نسبت پیچھے کے زیادہ دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے میں یہ نہیں دیکھتے ہیں۔ کہ ہم کیا جانتے ہیں۔ بلکہ یہ کہ کیا نہیں جانتے۔ جتنا اُن کا علم بڑھتا ہے۔ اُتنا ہی اپنی جہالت کے

علم سے اُن کی حیا زیادہ ہوتی ہے۔وہ سمندر کے تیراک ہوتے ہیں۔ ایک عمق کے بعد دوسرا عمق اُن کے آگے ہوتا ہے۔اُس کی تھاہ کبھی اُن کو نہیں ملتی۔یہ کم علم ندی نالوں کے تیراک ہوتے ہیں۔کہ جلدی سے تھاہ کو پاکے خوش ہو جاتے ہیں اور اُس پر گھمنڈ اور فخر کرتے ہیں۔عالموں کی نظروں کے روبرو۔پہاڑ پر پہاڑ اور ایک ہمالہ پر دوسرا ہمالہ آتا جاتا ہے۔جس سے اُن کا منظر فراخ ہوتا جاتا ہے۔ جتنا یہ منظر وسیع ہوتا ہے۔اُتنی ہی اُن کو حیا اپنی کوتاہ نظری کی بڑھتی جاتی ہے +

(محمد ذکاء اللہ)

محنت

ہر بشر کے پیچھے سب حالتوں میں محنت کرنے کا فرض لگا ہوا ہے۔ خواہ وہ کسی جماعت کا ہو۔جو شریف شرافت نسبی اور شرافت حقیقی تعلیم و تہذیب کے سبب سے رکھتا ہے۔وہ اپنے دل سے اِس امر کو اپنے اوپر فرض سمجھتا ہے۔کہ بہبود عوام اور رفاہ انام میں سعی کرکے محنت میں اپنا حصہ لوں۔اُس کو ہرگز یہ گوارائے خاطر نہیں ہوتا۔کہ مَیں اَوروں کی محنت سے کھاؤں پیوں۔میں فراغت سے رہوں اور اِس کا معاوضہ خود محنت کرکے اپنی سوسائٹی کو نہ دوں۔ عالی خیال نیک کردار اس تصور سے بھاگتا ہے۔کہ یونہیں بیٹھا رہے۔

اور دعوتیں اُڑایا کرے۔اور اُس کا معاوضہ کچھ نہ دے۔نکمّاپن اور سُستی نہ کوئی عزّت ہے۔نہ کوئی منفعت ہے۔اِس سے فرومایہ اور کمینہ طبائع راضی ہو جاویں۔مگر عالی ہمّت تو ایسی حالت کو مذلّت سمجھتے ہیں۔اور حقیقی عزّت اور عظمت سے اُسے بعید جانتے ہیں +

ایک دانشمندِ بلند خرد جو خود جد و جہد میں مجتہد تھا۔وہ اپنے بیٹے کو جو مدرسہ میں پڑھتا تھا۔یہ پند سود مند ارقام فرماتا ہے۔کہ اے میرے پیارے بیٹے! تیرے دل پر اس بات کا نقش شدّت سے زور دیکر نہیں جما سکتا۔کہ ہر امیر۔شریف۔غریب۔فقیر کی شرط زندگی محنت ہے۔غریب کسان روٹی اپنی پیشانی کی عرقریزی سے کماتا ہے۔اور امیر اپنی شکار کی جستجو میں سعی کرکے اپنی سُستی کو کھوتا ہے۔جیسے گیہوں کے کھیت میں بغیر ہل چلائے کاشتکار کو کچھ پیداوار ہاتھ نہیں لگتا۔ایسے ہی مزرعۂ دل میں تخم علم بغیر محنت کے بار آور نہیں ہوتا۔مگر ہاں اِن دونوں میں اتنا فرق ضرور ہے۔کہ ایسے اتفاقات اور واقعات پیش آسکتے ہیں۔کہ ایک کسان کھیت بوئے اور وہ اُس کی پیداوار سے محروم رہے اور کوئی دوسرا آدمی اُس سے مُتمتّع ہو۔مگر علم میں یہ نہیں ہو سکتا۔کہ آتش زدگی یا وقوع حادثات سے کوئی شخص اپنے مطالعہ علمی کی ریاضت کے ثمر سے محروم ہو جائے اور یہ ثمر دوسرے کو ملجائے۔اُس کے تحصیل علم کی تکمیل اور توسیع خاص اُسی کی ذاتی منفعت کے لئے ہے۔اِسی واسطے میرے پیارے بچّے

محنت کر اور وقت کو اچھّی طرح کام میں لا- لڑکپن میں ہمارے قدم ہلکے ہوتے ہیں اور دل ملائم- اُس میں علم خوب جڑ پکڑ سکتا ہے- آدمی کی بھی عمریں مثل فصلوں کے ہوتی ہیں- کہ اگر ایک فصل کی کاشت میں غفلت کیجئے- تو دوسری فصل میں حاصل کچھ نہیں ہوتا- پس اگر ہم اپنی طفلی اور جوانی جو خریف و ربیع کی فصلیں ہیں- ضائع کردینگے- تو بُڑھاپا ہمارا- کہ کھرسا کا موسم ہے- نہایت خوار اور ذلیل ہوگا+

(محمّد ذکاء اللہ)

شمس العلما مولوی سید محمّد حسین آزاد

سید محمّد حسین نام- آزاد تخلص- دہلوی- فن شعر میں شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد- علوم عربیہ و فارسیہ میں حظ وافی- گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی و فارسی کے پروفیسر تھے- اُردو میں ان کی نثر پایہ عالی رکھتی ہے- تشبیہ و تمثیل کا استعمال نہایت خوبی و لطافت سے کرتے ہیں +

اُردو اور انگریزی انشا پردازی پر کچھ خیالات

اگر زبان کو فقط اظہار مطالب کا وسیلہ ہی کہیں- تو گویا وہ ایک اوزار ہے- کہ جو کام ایک گونگے بچارے یا بچّے نادان کے اشارے سے ہوتے ہیں- وہی اِس سے ہوتے ہیں- لیکن حقیقت میں اُس کا مرتبہ اِن لفظوں سے بہت بلند ہے- زبان حقیقت میں ایک معمار ہے- کہ اگر چاہے تو باتوں باتوں میں ایک قلعۂ فولادی تیّار کردے- جو کسی

توپ خانے سے نہ ٹوٹ سکے۔ اور چاہے۔ تو ایک بات میں اُسے خاک میں ملادے۔ جس میں ہاتھ ہلانے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ زبان ایک جادوگر ہے۔ جو کہ طلسمات کے کارخانے الفاظ کے منتروں سے تیّار کردیتا ہے اور جو اپنے مقاصد چاہتا ہے۔ اِن سے حاصل کرلیتا ہے۔ وہ ایک نادر مُرصّع کار ہے۔ کہ جس کی دستکاری کے نمونے کبھی شاہوں کے سروں کے تاج اور کبھی شہزادیوں کے نو لکھے ہار ہوتے ہیں۔ کبھی علوم و فنون کے خزانوں سے زر و جواہر اُس کے قوم کو مالا مال کرتے ہیں۔ وہ ایک چالاک عیّار ہے۔ جو ہَوا پر گرہ لگاتا ہے اور دلوں کے قفل کھولتا اور بند کرتا ہے۔ یا مصوّر ہے۔ کہ نظر کے میدان میں مُرقّع کھینچتا ہے۔ یا ہَوا میں گلزار کِھلاتا ہے اور اُسے پھول۔ گُل۔ طوطی و بلبل سے سجا کر تیّار کر دیتا ہے +

اِس نادر دستکار کے پاس مانی اور بہزاد کی طرح موقلم اور رنگوں کی پیالیاں دھری نظر نہیں آتی ہیں۔ لیکن اِس کے اِستعاروں اور تشبیہوں کے رنگ ایسے خوش نما ہیں۔ کہ ایک بات میں مضمون کو شوخ کرکے لال چُہچُہا کر دیتا ہے۔ پھر بے اِس کے کہ بوند پانی اُس میں ڈالے۔ ایک ہی بات میں اُسے ایسا کر دیتا ہے۔ کہ کبھی نارنجی۔ کبھی گلناری۔ کبھی آتشی۔ کبھی ایسا بھینا بھینا گلابی رنگ دکھاتا ہے۔ کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح بوقلموں اور رنگا رنگ اور پھر سرتاپا عالمِ نیرنگ +

جس زبان میں ہم تم باتیں کرتے ہیں۔ اِس میں بڑے بڑے نازک قلم مصوّر گزر گئے ہیں۔ جن کے مرقعے آج تک آنکھوں اور کانوں کے رستے سے ہمارے تمھارے دلوں کو تازہ کرتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ آج کل گویا اُن کے قلم گِھس گئے ہیں اور پیالیاں رنگوں سے خالی ہوگئی ہیں۔ جس سے تمھاری زبان کوئی نئی تصویر یا باریک کام کا مرقع تیار کرنے کے قابل نہیں رہی۔ اور تعلیم یافتہ قومیں اِسے سُن کر کہتی ہیں۔ کہ یہ ناکامل زبان ہر قسم کے مطالب ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتی +

میرے دوستو! یہ قول اُن کا حقیقت میں بیجا نہیں ہے۔ ہر ایک زبان تعلیم یافتہ لوگوں میں جو عزّت پاتی ہے۔ تو دو سبب سے پاتی ہے۔ اوّل یہ کہ اُس کے الفاظ کے خزانے میں ہر قسم کے علمی مطالب ادا کرنے کے سامان موجود ہوں۔ دوم اُس کی انشا پردازی ہر رنگ اور ہر ڈھنگ میں مطالب کے ادا کرنے کی قوّت رکھتی ہو۔ ہماری زبان میں یہ دونوں صفتیں ہیں۔ مگر ناتمام ہیں۔ اور اُس کے سبب ظاہر ہیں +

علمی مطالب ادا کرنے کے سامانوں میں جو وہ مُفلس ہے۔ اُس کا سبب یہ ہے۔ کہ تم جانتے ہو۔ کُل ڈیڑھ سو برس تخمیناً اُس کی ولادت کو ہوئے۔ اِس کا نام اُردو خود کہتا ہے۔ کہ میں علمی نہیں۔ بازار کی زبان ہوں۔ اُٹھنے بیٹھنے۔ لین دین کی باتوں کے لئے کام میں آتی

ہوں۔ سلاطین چغتائیہ کے وقت تک اِس میں تصنیف و تالیف کا رواج نہ تھا۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو۔ کہ ایک بچّہ شاہجہاں کے گھر میں پیدا ہو۔ اور انگریزی اقبال کے ساتھ ستارہ چمکے۔ جب صاحب لوگ یہاں آئے۔ تو اُنھوں نے ملکی زبان سمجھ کر اِس کے سیکھنے کا اِرادہ کیا۔ مگر سوا چند دیوانوں کے اُس میں نثر کی کتاب تک نہ تھی۔ اُن کی فرمائش سے کئی کتابیں۔ کہ فقط افسانے اور داستانیں تھیں۔ تصنیف ہوئیں اور اُنھی کے ڈھب کی صرف و نحو بھی درست ہوئی۔ ۱۸۳۵ء سے دفتر بھی اُردو ہونے شروع ہوئے۔ ۱۸۳۶ء میں ایک اُردو اخبار جاری ہوا۔ ۱۸۴۲ء سے دہلی کی سوسائٹی میں علمی کتابیں اِسی زبان میں ترجمہ ہونے لگیں اور اُردو نے برائے نام زبان کا تمغا اور سکّہ پایا۔ اب خیال کرنا چاہئے۔ کہ جس زبان کی تصنیفی عمر کل ستّر بہتّر برس کی ہو۔ اُس کی بساط کیا۔ اور اُس کے الفاظ کے ذخیرے کی کائنات کیا۔ پس اِس وقت ہمیں اُس کی کمی الفاظ سے دل شکستہ ہونا نہ چاہئے۔

میرے دوستو! کسی زبان کو لفظوں کے اعتبار سے مُفلس یا صاحب سرمایہ کہنا بیجا ہے۔ ہر زبان اہلِ زبان کے باعلم ہونے سے سرمایہ دار ہوتی ہے۔ اور کسی ملک والے کا یہ کہنا۔ کہ علمی تصنیف یا بات چیت میں اپنے ہی ملک کے الفاظ بولیں۔ بالکل بیجا ہے۔

عربی بھی ایک علمی زبان تھی۔ مگر دیکھ لو۔ اُس میں سارے لفظ تو عربی نہیں۔ صدہا رومی۔ صدہا یونانی۔ صدہا فارسی کے لفظ ہیں

وغیرہ وغیرہ- اور زبان فارسی کا تو کچھ ذکر ہی نہیں- انگریزی زبان آج علوم کا سرچشمہ بنی بیٹھی ہے- مگر اس میں بھی غیر زبان کے لفظوں کا طوفان آرہا ہے- زبان کا قاعدہ یہ ہے- کہ پہلے اہلِ ملک میں علم آتا ہے- پھر علمی اشیا کے لئے الفاظ یا تو اُس علم کے ساتھ آتے ہیں- یا وہیں ایجاد ہو جاتے ہیں+

علمی الفاظ کا ذخیرہ خدا نے بناکر نہیں بھیجا- نہ کوئی صاحبِ علم پہلے سے تیار کرکے رکھ گیا- جیسے جیسے کام اور چیزیں پیدا ہوتی گئیں- ویسے ہی اُن کے الفاظ پیدا ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں- اوّل خاص و عام میں علم پھیلتا ہے- ساتھ ہی اس کے الفاظ بھی عام ہوتے ہیں- مثلاً ریل کا انجن اور اُس کے کارخانے کے صدہا الفاظ ہیں- کہ پہلے یہاں کوئی نہیں جانتا تھا- جب وہ کارخانے ہوئے- تو ادنے ادنے ناخواندے سب جان گئے- اگر بے اُس کے وہ الفاظ یہاں ڈھونڈتے یا پہلے یاد کراتے- تو کسی کی سمجھ میں بھی نہ آتے- اِسی طرح مثلاً میجک لینٹرن اس وقت یہاں کوئی نہیں جانتا- خواہ اُس کا یہی نام لیں- خواہ فانوس جادو کہیں- خواہ اچنبھے کا تماشا کہیں- ہرگز کوئی نہیں سمجھیگا- لیکن اگر مشاہدے میں عام ہوجائے اور گھر گھر میں جاری ہو جائے- تو اُلٹے سے اُلٹا اُس کا نام رکھ دیں- وہی بچے بچے کی زبان پر مشہور ہو جائے گا اور وہی سب سمجھیں گے+

انگریزی میں جو علمی الفاظ ہیں مثلاً ٹیلیگراف یا ایلکٹریسٹی وغیرہ وغیرہ

اُن میں بھی بہت سے الفاظ ایسے ہیں۔کہ وہ اپنے اصل معانی پر پوری دلالت نہیں کرتے۔مگر چونکہ ملک میں علم عام ہے اور وہ چیزیں عام ہیں۔اِس لئے الفاظ مذکورہ بھی ایسے عام ہیں۔کہ سب بے تکلّف سمجھتے ہیں۔پس لفظوں کی کوتاہی ہماری زبان میں اگر ہے۔ تو اِس سبب سے ہے۔کہ وہ بے علمی کے عہد میں پیدا ہوئی اور اِسی عہد میں پرورش اور تربیت پائی۔اب اِس کی تدبیر ہو سکتی ہے۔تو اہلِ ملک ہی سے ہو سکتی ہے۔وہ یہ ہے۔کہ خود علوم و فنون حاصل کرو۔اپنے ملک میں پھیلاؤ اور بھائی بندوں کو اُس سے آگاہ کرو۔جب اُس میں سبب قسم کے کار و بار ہونگے۔تو اُن کے الفاظ بھی ہونگے۔ملک کے افلاس کے ساتھ زبان سے بھی افلاس کا داغ مٹ جائیگا +

(محمّد حسین آزاد)

تذکرۂ ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق

جب وہ صاحب کمال عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا۔ تو فصاحت کے فرشتوں نے باغِ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرتِ عام بنکر جہان میں پھیلی اور رنگ نے بقاے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا۔ تو آبِ حیات اُس پر شبنم ہوکر برسا۔ کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکّہ اُس کے نام سے موزوں ہوا اور اُس کے طغراے شاہی میں یہ نقش ہوا۔ کہ اِس پر نظم اُردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں۔ کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو سبب اِس کا یہ ہے۔ کہ جس باغ کا بلبل تھا۔ وہ باغ برباد ہوگیا۔ نہ ہم صفیر رہے۔ نہ ہم داستان رہے۔ نہ اِس بولی کے سمجھنے والے رہے۔ جو خراب آباد اُس زبان کے لئے ٹکسال تھا۔ وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے۔ شہر چھاؤنی سے بدتر ہوگیا۔ اُمرا کے گھرانے تباہ ہو گئے۔ گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہوکر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں ؟ جو بات بات میں دِل پسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں۔ آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ بالی نے اِس قسم کی ایجاد و اختراع کی فرصتیں دی ہیں۔ وہ اَور اَور اصل کی شاخیں ہیں۔ اُنھوں نے اَور پانی سے نشو و نما پائی ہے۔ وہ اَور ہی

ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں۔ پھر اُس زبان کی ترقی کا کیا بھروسا +

کیسا مبارک زمانہ ہوگا۔ جب کہ شیخ مرحوم اور میرے والدِ مغفور ہم عمر ہونگے۔ تحصیل علمی اُن کی عمروں کی طرح حالت طفلی میں ہوگی۔ صَرف و نحو کی کتابیں ہاتھوں میں ہونگی اور ایک اُستاد کے دامن شفقت میں تعلیم پاتے ہونگے۔ اُن نیک نیت لوگوں کی ہر ایک بات استقلال کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی۔ وہ رابطہ اُن کا عمروں کے ساتھ بڑھتا گیا اور اخیر وقت تک ایسا نبھ گیا۔ کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا۔ اُن کے تحریرِ حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے۔ مگر کیا کروں جی یہ ہی چاہتا ہے۔ کہ کوئی حرف اِس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اِس سبب سے ہو۔ کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے۔ لیکن نہیں۔ اُس شعر کے پُتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کاری کی کل میں کونسے پُرزے کو کہہ سکتے ہیں! کہ نکال ڈالو۔ یہ کام کا نہیں۔ اور کونسی حرکت اُس کی ہے۔ جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ اسی واسطے میں لکھونگا اور جو بات اُن کے سلسلۂ حالات میں مسلسل ہو سکیگی۔ اُس کا ایک حرف نہ چھوڑونگا +

شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ مگر زمانہ کے تجربہ اور بزرگوں کی صحبت نے اُنہیں حالاتِ زمانہ سے ایسا باخبر کر دیا تھا۔ کہ اُن کی زبانی باتیں کتب تواریخ کے قیمتی سرمائے تھے۔ وہ دِلّی میں کابلی دروازے کے پاس رہتے تھے۔ اور نواب لطف علی خان نے

اُنھیں معتبر اور بالیاقت شخص سمجھکر اپنی حرم سرا کے کار و بار سپرد کر رکھے تھے۔ شیخ علیہ الرحمۃ اُن کے اِکلوتے بیٹے تھے۔ کہ ۱۲۰۴ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ اُس وقت کسے خبر ہوگی۔ کہ اِس رمضان سے وہ چاند نکلے گا۔ جو آسمانِ سخن پر عید کا چاند ہوکر چمکے گا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے۔ تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ اِن کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلّہ کے اکثر لڑکے اُنھیں کے پاس پڑھتے تھے۔ اِنھیں بھی وہیں بٹھا دیا۔ حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے۔ **شوق** تخلص کرتے تھے۔ اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں۔ ویسے شعر کہتے تھے۔ محلّہ کے شوقین نوجوان دلوں کی اُمنگ میں اُن سے کچھ کچھ کہوا لے جایا کرتے تھے۔ اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت اُن کے ہاں یہی چرچا رہتا تھا۔

شیخ مرحوم خود فرماتے تھے۔ کہ وہاں سُنتے سُنتے مجھے بہت شعر یاد ہوگئے۔ نظم کے پڑھنے اور سُننے میں دل کو ایک روحانی لذّت حاصل ہوتی تھی اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھرا کرتا تھا۔ دل میں شوق تھا۔ اور خدا سے دعائیں مانگتا تھا۔ کہ الٰہی! مجھے شعر کہنا آجائے۔ ایک دن خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے۔ اور یہ فقط حُسنِ اتفاق تھا۔ کہ ایک حمد میں تھا۔ ایک نعت میں۔ مجھے اِتنا ہوش تو کہاں تھا۔ کہ اِس مبارک مُہم کو خود اِس طرح سمجھ کر شروع کرتا۔ کہ پہلا حمد میں ہو اور دوسرا نعت میں۔ جب یہ خیال بھی نہ تھا۔ کہ اِس قدرتی اتفاق

کو مبارک فال سمجھوں۔ مگر اُن دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے۔ جو خوشی دل کو ہوئی۔ اُس کا مزہ اب تک نہیں بھولتا۔ اُنہیں کہیں اپنی کتاب میں۔ کہیں جابجا کاغذوں پر رنگ برنگ کی روشنائی سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو سُناتا تھا اور خوشی کے مارے پھولوں نہ سماتا تھا۔ غرضکہ اِسی عالم میں کچھ کہتے رہے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے +

اِسی محلّہ میں میر کاظم حسین نام ایک اِن کے ہم سن ہم سبق تھے۔ بیقرار تخلص کرتے تھے اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر ذہن کی جودت اور طبیعت کی برّاقی کا یہ عالم تھا۔ کہ کبھی برق تھے اور کبھی باد و باراں۔ اُنہیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں اچھے اچھے موقعے ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور وہ اتحاد طبعی کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے

+ + + + + + + + + + + + +

ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سُنائی۔ شیخ مرحوم نے پوچھا۔ یہ غزل کب کہی ؟ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ اُنہوں نے کہا۔ ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ اُنہیں سے یہ اصلاح لی ہے۔ شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا۔ اور اُن کے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے +

سلسلۂ اصلاح جاری تھا۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ لوگوں کی واہ وا طبیعتوں کو بلند پروازیوں کے پَر لگاتی تھی۔ کہ رشک

جو تلامیذ الرحمٰن کے آئینوں کا جوہر ہے۔ اُستاد شاگردوں کو چمکانے لگا۔ بعض موقع پر ایسا ہوا۔ کہ شاہ صاحب نے ان کی غزل کو دیکھکر بے اصلاح پھیر دیا اور کہا۔ کہ طبیعت پر زور ڈالکر کہو۔ کبھی کہدیا۔ یہ کچھ نہیں۔ پھر سوچکر کہو۔ بعض غزلوں کو جو اصلاح دی۔ اُس سے بے ادائی پائی گئی۔ اِدھر انہیں کچھ تو یاروں نے چمکا دیا۔ کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزردگی پیدا کی۔ کہ شاہ صاحب اصلاح میں بے توجہی یا پہلو تہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اِس طرح کئی دفعہ غزلیں پھیریں۔ بہت سے شعر کٹ گئے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی۔ کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین منیر تھے۔ جو برّاقی طبع میں اپنے والد کے خلف الرشید تھے۔ اُن کی غزلوں میں توارد سے۔ یا خدا جانے کس اتفاق سے وہی مضمون پائے گئے۔ اس لئے انہیں زیادہ رنج ہوا +

اگرچہ اِن کی طبیعت حاضر۔ فکر رسا۔ بندش چست۔ اُس پر کلام میں زور۔ سب کچھ تھا۔ مگر چونکہ یہ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے۔ نہ دنیا کے معاملات کا تجربہ تھا۔ نہ کوئی ان کا دوست ہمدرد تھا۔ اِس لئے رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اِسی قیل و قال میں ایک دن سودا کی غزل پر غزل کہی۔ "دوشِ نقشِ پا۔ آغوشِ نقشِ پا" شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ اُنھوں نے خفا ہوکر غزل پھینکدی۔ کہ اُستاد کی غزل پر غزل کہتا ہے! اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اُڑنے لگا۔ اِن دنوں میں ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق نے بیقرار کرکے گھر سے

نکالا۔ مشاعرہ میں جاکر غزل پڑھی۔ وہاں بہت تعریف ہوئی۔ اُس دن سے جُرأت زیادہ ہوئی۔ اور بے اصلاح مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے۔ اب کلام کا چرچا زیادہ تر ہوا۔ طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سُننے والوں کے دلوں میں اثر برقی کی طرح دوڑانے لگی۔ اُس زمانہ کے لوگ منصف ہوتے تھے۔ بزرگانِ پاک طینت جو اَساتذۂ سلف کے یادگار باقی تھے۔ مشاعرہ میں دیکھتے۔ تو شفقت سے تعریفیں کرکے دل بڑھاتے۔ بلکہ غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھوا کر سُنتے +

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ اُنہیں تو شعر سے کچھ رغبت نہ تھی۔ مگر مرزا ابوظفر ولیعہد۔ کہ بادشاہ ہوکر بہادر شاہ ہوئے۔ شعر کے عاشقِ شیدا تھے اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اِس لئے دربار شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے۔ وہیں آکر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سناتے تھے۔ مطلع اور مصرع جلسہ میں ڈالتے تھے۔ ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا تھا۔ مصرع پر مصرع لگاکر طبع آزمائی کرتا تھا۔ میر کاظم حسین بیقرار۔ کہ ولیعہد موصوف کے ملازم خاص تھے۔ اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے تھے۔ شیخ مرحوم کو خیال ہوا۔ کہ اِس جلسہ میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوّتِ فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔ لیکن اُس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی۔ جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا۔ چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے اور اکثر دربار ولیعہدی میں جانے لگی +

شاہ نصیر مرحوم۔کہ ولیعہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے۔ دکن چلے گئے۔میر کاظم حسین اُن کی غزل بنانے لگے۔ اُنہیں دنوں میں جان انفنسٹن صاحب شکار پور سندھ وغیرہ سرحدات سے لیکر کابل تک عہد نامے کرنے کو چلے۔ اُنہیں ایک میر منشی کی ضرورت ہوئی۔کہ قابلیت و علمیت کے ساتھ امارت خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔میر کاظم حسین نے اُس عہدہ پر سفارش کے لئے ولیعہد سے شُقّہ چاہا۔مرزا مُغل بیگ اُن دنوں میں مُختار کُل تھے اور وہ ہمیشہ اِس تاک میں رہتے تھے۔کہ جس پر ولیعہد کی زیادہ نظر عنایت ہو۔اُس کو سامنے سے سرکاتے رہیں۔اِس قدرتی پیچ سے میر کاظم حسین کو شقّۂ سفارش آسان حاصل ہوگیا اور وہ چلے گئے +

چند روز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولیعہد کے ہاں گئے۔ تو دیکھا۔کہ تیراندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے۔کہ میاں ابراہیم۔ اُستاد تو دکن گئے۔ میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے۔ تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا۔اُسی وقت ایک غزل جیب سے نکالکر دی۔کہ ذرا اِسے تو بنادو۔یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بناکر سُنائی۔ ولیعہد بہادر بہت خوش ہوئے۔ اور کہا۔کہ بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو۔غرض چند روز اصلاح جاری رہی اور آخر کو سرکار ولیعہدی سے چار روپیہ مہینہ بھی ہوگیا + + + + + + +

چند سال کے بعد اُنھوں نے ایک قصیدہ کہکر اکبر شاہ کے دربار

میں سُنایا۔ جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع بدائع صرف کئے تھے۔ مطلع اُس کا یہ ہے :-

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھیرا مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

اِس پر بادشاہ نے خاقانیٔ ہند کا خطاب عطا کیا۔ اُس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی ؀

اواخر ایام میں ایک بار بادشاہ (بہادر شاہ) بیمار ہوئے۔ جب شفا پائی اور اُنھوں نے ایک قصیدۂ غرّا کہکر نذر گزرانا۔ تو خلعت کے علاوہ خطاب **خان بہادر** اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی انعام ہوا۔ پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہکر گزرانا جس کا مطلع یہ ہے :-

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت
نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

۲۴۔ صفر ۱۲۷۱ہجری جمعرات کا دن تھا۔ ۱۷ دن بیمار رہکر وفات پائی مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا :-

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

(محمد حسین آزاد)

میرزا اسد اللہ خان غالب

اسد اللہ خان نام۔ میرزا نوشہ عرف۔ چندے اسد پھر غالب تخلص کیا۔ سرکار شاہی سے نجم الدولہ دبیر الملک خطاب تھا۔ سرکار انگریزی سے پنشن پاتے تھے۔ اکبر آباد مولد و دہلی مسکن۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں بعمر ۷۳ سال راہی ملک بقا ہوئے۔ ان کا کلام زیادہ تر فارسی ہے۔ اُردو میں ایک مختصر دیوان اور ایک مجموعۂ رقعات ہے۔ اُس زمانہ میں مقفیٰ نویسی کی وبا عام ہو رہی تھی۔ میرزا نے بھی اس کی رعایت کی۔ مگر محاورہ کو اندھا کانا نہیں بننے دیا۔ اِس کے علاوہ لمبے چوڑے القاب و آداب اور تکلفات لایعنی سے اتشلے اُردو کو پاک کیا۔ وہ اپنے رقعات کی نسبت خود فرماتے ہیں "میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے۔ کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو" +

خط ۱

برخور دار! تمھارا خط پہنچا۔ لکھنؤ کا کیا کہنا ہے! وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ! وہ سرکار امیر گر تھی۔ جو بے سرو پا وہاں پہنچا۔ امیر بن گیا۔ اُس باغ کی یہ فصلِ خزاں ہے + میں بہت خوشی سے تم کو اِطلاع دیتا ہوں۔ کہ اُردو کا دیوان غاصبِ نا انصاف سے ہاتھ آگیا۔ اور میں نے نور چشم منشی شیو نراین کو بھیجدیا۔ یقین کُلّی ہے۔ کہ وہ چھاپینگے جہاں تم ہوگے۔ ایک نسخہ تم کو پہنچ جاے گا + طریقۂ سعادت مندی یہ ہے۔ کہ ہم کو اپنی خیر و عافیت کا طالب جانکر جہاں جاؤ۔ وہاں سے خط لکھتے رہو اور اپنے مسکن کا پتا ظاہر کرتے رہو۔ ہم تم سے راضی ہیں اور چونکہ تمھاری خدمت اچھی طرح نہیں کی۔ شرمندہ بھی ہیں +

راقم اسد اللہ خان

مرقومۂ شنبہ روز عید مطابق ۳۰ جون سنہ ۱۸۶۰ء

خط ۲

اجی مرزا تفتہ! تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے! کیا بُری کاپی ہے! اپنے اشعار کی اور اِس کاپی کی مثال جب تم پر کھُلتی۔ کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے۔ پائچے لیرلیر۔ جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلّف سنبلستان ایک معشوق خوبرو ہے۔ بدلباس ہے۔ بہر حال دونوں لڑکوں کو دونوں جلدیں دیدیں۔ اور مُعلّم کو حکم دیا۔ کہ اِسی کا سبق دے۔ چنانچہ آج سے شروع ہوگیا +

مرقومۂ صبح سہ شنبہ ۹۔ ماہ اپریل ۱۸۶۱ء (غالب)

خط ۳

او میاں سید زادۂ آزادہ! دلّی کے عاشقِ دلدادہ! ڈھئے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے! حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے! نہ دل میں مہر و آزرم۔ نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں؟ ذوق کہاں؟ مومن خان کہاں؟ ایک آزردہ سو خاموش۔ دوسرا غالب۔ وہ بیخود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی۔ نہ سخندانی۔ کس برتے پر تتّا پانی۔ ہائے دلّی! وائے دلّی! بھاڑ میں جائے دلّی! سنو صاحب! پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمدؐ حسین خان ولد سردار خان ولد دلاور خان اور نانا اُس احمدؐ حسین خان کے غلام حسین خان ولد مصاحب خان۔ اِس شخص کا حال از روے

تحقیق مشترح اور مفصّل لکھو۔ قوم کیا ہے؟ معاش کیا ہے؟ طریق کیا ہے؟ عمر کیا ہے؟ لیاقتِ ذاتی کا کیا رنگ ہے؟ طبیعت کا کیا ڈھنگ ہے؟ بھائی! لکھو اور جلد لکھو + (غالب)

خط ۴

بھائی! تم کیا فرماتے ہو؟ جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا۔ مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا۔ کہ نہ لٹتا؟ ہاں بھائی ضیاء الدین خان صاحب اور ناظر حسین میرزا صاحب ہندی اور فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لیکر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو اُن دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی۔ نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں؟ ہاں تم کو اطلاع دیتا ہوں۔ کہ مئی کی گیارھویں ۱۸۵۷ء سے جولائی کی اکتیسویں ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا اپنا حال میں نے نثر میں لکھا ہے۔ اور وہ نثر فارسی زبانِ قدیم میں ہے۔ کہ جس میں کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ اور ایک قصیدہ فارسی متعارف عربی و فارسی ملی ہوئی زبان میں حضرت فلک رفعت جناب ملکۂ معظمۂ انگلستان کی ستائش میں اِس نثر کے ساتھ شامل ہے۔ یہ کتاب مطبع مفید خلائق آگرہ میں منشی نبی بخش صاحب حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر اور منشی ہرگوپال تفتہ کے اہتمام میں چھاپی گئی ہے۔ فی الحال مجموعہ میری نظم و نثر کا اِس کے سوا اور کہیں نہیں۔ اگر جناب منشی امیر علی خان صاحب میرے

کلام کے مشتاق ہیں۔ تو نسخۂ موسوم بہ دستنبو مطبع مفید خلائق آگرہ سے منگالیں + (غالب)

خط ۵

خان صاحب عالی شان مردان علی خان صاحب کو فقیر غالب کا سلام۔ نظم و نثر دیکھکر دل بہت خوش ہوا۔ آج اِس فن میں تم یکتا ہو۔ خدا تم کو سلامت رکھے۔ بھائی جفا کے مؤنث ہونے میں اہل دہلی و لکھنؤ کو باہم اِتفاق ہے۔ کبھی کوئی نہ کہیگا۔ کہ جفا کیا۔ ہاں بنگالہ میں جہاں بولتے ہیں۔ کہ ہتھنی آیا۔ اگر جفا کو مذکر کہیں تو کہیں۔ ورنہ ستم و ظلم و بیداد مذکر اور جفا مؤنث ہے بے شبہ و شک و السلام + (غالب)

خط ۶

بندہ نواز! زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوّت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے:۔

مُضمحل ہو گئے قوےٰ غالب وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں۔ سب دوستوں کو جن سے خط کتابت رہتی ہے۔ اُردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط و مکاتیب لکھے اور بھیجے تھے۔ اُن میں سے جو صاحب الی الآن ذی حیات و موجود ہیں۔ اُن سے بھی عند الضرورت اِسی زبان مروج میں مکاتبت و

مراسلت کا اتفاق ہوتا ہے۔ پارسی مکتوبوں۔رسالوں۔نسخوں اور کتابوں کے مجموعے شیرازہ بستہ ہوکر اطراف و اقصائے عجم میں پھیل گئے۔حال کی نثروں کو کون فراہم کرنے جائے۔جاں کنی کے خیالات نے مجھکو ان کی تحریر سے دست بردار و آزاد و سبک دوش کر دیا۔جو نثریں کہ مجموع ویک جا ہوکر جہاں جہاں مُنتشر ہو گئی ہیں اور آیندہ ہوں۔اُنہیں کو جنابِ احدیت جلّت عظمتہٗ مقبولِ قلوبِ اہلِ سخن و مطبوعِ طبائعِ اربابِ فن فرمائے۔میں اب انتہائے عمر ناپائدار کو پہنچکر آفتابِ لبِ بام اور ہجوم امراضِ جسمانی و آلامِ روحانی سے زندہ در گور ہوں۔کچھ یادِ خدا بھی چاہیے۔نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام ایزدِ دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔اگر اُس نے چاہا۔تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہیگا۔پس اُمید وار ہوں۔کہ آپ انہیں نذورِ محقّرہ یعنی تحریراتِ روز مرۂ اُردوے سادہ و سرسری کو تا امکان غنیمت جان کر قبول فرماتے رہیں۔اور درویش دلریش و فرماندۂ کشاکشِ معاصی کے خاتمہ بخیر ہونے کی دعا مانگیں۔اللّٰہ بس ماسوائے ہوس۔تعقید معنوی کو حضور خود جانتے ہونگے۔اس کی توضیح و تفصیل میں تحصیل حاصل و تطویل لا طائل کی صورت نظر آتی ہے۔لہذا خامہ فرسائی بروے کار نہیں آئی + (غالب)

خط ۷

سبحان اللہ! سرآغازِ فصل میں ایسے ثمرہاے پیش رس کا پہنچنا

نوید ہزار گونہ میمنت و شادمانی ہے۔ یہ ثمر ربّ النوّع اثمار ہے۔ اِس کی تعریف کیا کروں۔ کلام اِس باب میں کیا چاہتا ہوں۔ کہ میں یاد رہا اور اہدا کا آپ کو خیال آیا۔ پروردگار آپ کو با ایں ہمہ رواں پروری و کرم گستری و یاد آوری سلامت رکھے۔ جمعہ کے دن دو پہر کے وقت کہار پہنچا اور اُسی وقت جواب لیکر اور آم کے دو ٹوکرے دیکر روانہ ہوگیا۔ یہاں سے اُس کو حسب الحکم کچھ نہیں دیا گیا + (غالب)

خط ۸

جناب قاضی صاحب کو میری بندگی پہنچے۔ مکرمی مولوی غلام غوث خان صاحب بہادر میر منشی کا قول سچ ہے۔ اب میں تندرست ہوں۔ پھوڑا پھنسی کہیں نہیں۔ مگر ضعف کی وہ شدّت ہے۔ کہ خدا کی پناہ! ضعف کیونکر نہ ہو؟ برس دن صاحب فراش رہا ہوں۔ ستّر برس کی عمر۔ جتنا خون بدن میں تھا۔ بے مبالغہ آدھا اُس میں سے پیپ ہوکر نکل گیا۔ سن کہاں؟ جو اَب پھر تولیدِ دمِ صالح ہو۔ بہر حال زندہ ہوں اور ناتواں اور آپ کی پرسشہاے دوستانہ کا ممنونِ احسان۔ والسلام مع الاکرام + (غالب)

خط ۹

پیر و مرشد! نواب صاحب کا وظیفہ خوار۔ گویا اِس در کا فقیرِ تکیہ دار ہوں۔ مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رام پور آیا۔ میں کہاں اور بریلی کہاں! ۱۳ اکتوبر کو یہاں پہنچا۔ بشرطِ حیات آخرِ دسمبر تک

دہلی جاؤنگا۔ نمائش گاہ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں! خود اِس نمائش گاہ کی سیر میں۔ جس کو دنیا کہتے ہیں۔ دل بھر گیا۔ اب عالمِ بیرنگی کا مشتاق ہوں۔ لا الٰہ الّا اللہ۔ لاموجود اِلّا اللہ۔ لاموثر فی الوجودِ الّا اللہ +

(غالب)

خط ۱۰

قبلہ! آپ بے شک ولی صاحب کرامت ہیں۔ کم و بیش ایک ہفتہ گزرا ہوگا۔ کہ ایک امرِ جدید مقتضی اِس کا ہوا۔ کہ آپ کو اُس کی اطلاع دوں۔ خانۂ کاہلی خراب! آج لکھوں۔ کل لکھوں۔ اب کون لکھے؟ کل صبح کو لکھوں گا۔ صبح ہوئی۔ غالب! اس وقت نہ لکھ۔ سہ پہر کو لکھیو۔ آج دو شنبہ ۲۳۔ جولائی کی بارہ پر دو بجے ہرکارہ نے آپ کا خط دیا۔ پلنگ پر پڑے پڑے خط پڑھا اور اُسی طرح جواب لکھا۔ اگرچہ ڈاک کا وقت نہ رہا تھا۔ مگر بھجوا دیا۔ کل روانہ ہو رہیگا + آپ کو معلوم رہے۔ کہ منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب مصطفٰے خان حسرتی کو کبھی اُردو خط نہیں لکھا۔ ہاں ذکا کو غزل اصلاحی کے ہر شعر کے تحت میں منشاے اصلاح سے آگہی دی جاتی ہے۔ نواب صاحب کو یوں لکھا جاتا ہے۔ "کہار آیا۔ خط لایا۔ آم پہنچے۔ کچھ بانٹے۔ کچھ کھائے۔ بچّوں کو دعا۔ بچّوں کی بندگی۔ مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام" یہ تحریر اِس ہفتہ میں گئی ہے۔ غرض کہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں۔ یہ لائقِ شمول مجموعۂ نثر اُردو کہاں ہے؟

یقین جانتا ہوں۔کہ ایسی نثروں کو آپ خود نہ درج کرینگے + کتاب کے باب میں سرمد کی رباعی کا شعر اخیر لکھدینا کافی ہے:-

عالم ہمہ مرآتِ جمالِ ازلی است مے باید دید و دم نمی باید زد

بوستانِ خیال کا ترجمہ موسوم بہ حدائق الانظار مَعرضِ طبع میں ہے۔ اگر آپ یا آپ کا کوئی دوست خریدار ہو۔ تو جتنے مجلّد فرمائیے۔اُس قدر بھجوادوں۔چھ روپیہ مع محصول ڈاک قیمت ہے۔ اُسی مطبع میں جس میں حدائق الانظار کا انطباع ہوا ہے۔اخبار بھی چھاپا جاتا ہے۔ اب کے ہفتہ کا دو ورقہ بھیجدونگا۔ بشرطِ پسند آپ توقیع خریداری لکھ بھیجئے گا + جناب کیمسن صاحب افسر مدارس غرب و شمال کا باوجودِ عدمِ تعارف خط مجھ کو آیا۔کچھ اُردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا۔ اُس کا جواب لکھ بھیجا۔ نظم و نثر اُردو طلب کی تھی۔ مجموعۂ نظم بھیجدیا۔نثر کے باب میں تمھارا نام نہیں لکھا۔مگر یہ لکھا۔کہ مطبع الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے۔بعدِ انطباع و حصولِ اطلاع وہاں سے منگاکر بھیجدونگا۔ زیادہ حد ادب۔نامۂ جواب طلب + (غالب)

خط ۱۱

قبلہ! پیری و صد عیب۔ساتویں دہاکے کے مہینے گن رہا ہوں۔ قولنج آگے دوری تھا۔اب دائمی ہو گیا ہے۔ مہینا بھر میں پانچ سات بار فضولِ مجتمعہ دفع ہو جاتے ہیں اور یہی منشاء حیات ہے۔ غذا کم ہوتے ہوتے۔ اگر مفقود نہ کہو۔ تو بمنزلۂ مفقود کہو۔ پھر گرمی نے مار ڈالا۔

ایک حرارتِ غریبہ جگر میں پاتا ہوں۔ جس کی شدّت سے بُھنا جاتا ہوں۔ اگرچہ جُرعہ جرعہ پیتا ہوں۔ مگر صبح سے سوتے وقت تک نہیں جانتا۔ کہ کتنا پانی پی جاتا ہوں + میرے ایک رشتہ کے بھتیجے نے بوستانِ خیال کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ میں نے اُس کا دیباچہ لکھا ہے۔ ایک دو ورقہ اُس کا نہ بصورتِ پارسل بلکہ بلفِّ خط ہذا بھیجتا ہوں۔ آپ کا مقصود دیباچہ ہے۔ سو نقل کر لیجئے۔ میرا مدعا اِس دو ورقہ کے ارسال سے یہ ہے۔ اگر آپ کی پسند آئے یا اَور اشخاص خریدنا چاہیں۔ تو چھ روپیہ قیمت اور محصول ذمہ خریدار ہے + (غالب)

از مؤلّف

جنگ مرہٹہ و دُرّانی

احمد شاہ والی کابل ہندوستان پر تین حملے کر چُکا تھا اور صوبۂ پنجاب کو مُمالک محروسہ میں شامل کرکے نجیب الدولہ رُہیلہ کو شاہ دہلی کی امداد کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ مگر مغلیہ اُمرا کو خود غرضی اور نا اتفاقی کے مرض نے ایسا چر لیا تھا۔ کہ ایک کو ایک کھائے جاتا تھا۔ اِدھر عماد الملک وزیر دہلی مرہٹوں اور جاٹوں کو نجیب الدولہ پر چڑھا لایا۔ اُدھر آدینہ بیگ خان سابق صوبہ دار پنجاب نے مرہٹوں اور سکھوں کی کمک لیکر دُرّانیوں کو اٹک پار بھگا دیا۔ اب سواحلِ دکن سے

وادی اٹک تک مرہٹوں کا پھریرا لہرا رہا تھا اور ہندوستان کے کھونٹ کھونٹ میں اُن کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ناچار نجیب الدولہ نے احمد شاہ کو عرضی لکھی۔ کہ حضور والا جلد تشریف لائیں اور ہماری ننگ و ناموس کو مرہٹوں کے دستِ تعدّی سے بچائیں۔ ورنہ یہ قوم تختِ مغلیہ کو اُلٹ دیگی اور ہمارا نام و نشان ہندوستان سے مٹا دیگی +

اِس عرضداشت کو پڑھکر احمد شاہ پھر عازم ہند ہوا اور زیرِ دامن کوہِ ہمالہ کوچ کرتا ہوا۔ بلا تعرّض سہارنپور تک آپہنچا۔ یہاں نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خان وغیرہ سردارانِ رُہیلہ باریاب ملازمت ہوئے اور دُرّانی فوج کی کمک لے کر مرہٹوں کو نواح دہلی سے مار پیٹ کر نکالدیا اور جب تک چنبل پار نہ ہوگئے۔ اُن کا پیچھا نہ چھوڑا +

مرہٹوں کا سردار راگھو باجی ہندوستان سے جب اِس ناکامی کے ساتھ واپس گیا۔ تو بھاؤ جو مرہٹوں کا وزیر اعظم اور سپہ سالار تھا۔ اُس کے دل میں غیظ و غضب کی آگ بھڑکی۔ اُس وقت مرہٹوں کا اقتدار منتہاے عُروج پر پُہنچ گیا تھا۔ آراستہ رسالے ۔ باقاعدہ پلٹنیں اور عمدہ توپخانے اُن کے پاس موجود تھے۔ اُن کے دربار کی شان و شکوہ بھی مغلیہ دربار سے ہمسری کا دم بھرتی تھی۔ لہذا بھاؤ ایک لشکرِ عظیم فراہم کرکے بڑے کرّ و فر کے ساتھ دلّی کی طرف روانہ ہوا۔ تاکہ مغلیہ سلطنت کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ کر پھینک دے اور اِس کاخِ کُہن کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔ جب وہ دلّی کے زیر فصیل آپُہنچا۔ تو درانیوں

کی قلیل جماعت ایک خفیف مقابلہ کے بعد پس پا ہوگئی۔ بھاؤ نے دلّی پر قابض ہوکر مَساجد و مَقابر اور مَحلات شاہی کو خوب تاراج کیا۔ دربار عام کا نقرئی کٹہرا اُکھڑواکر اور بیگمات کا زیور تک اُتروا کر گلا ڈالا۔ اگر اَور سردار مانع و مزاحم نہ ہوتے۔ تو بھاؤ آمادہ تھا۔ کہ بسواس راؤ کو تخت دہلی پر بٹھائے اور چار دانگ ہند میں مرہٹوں کا سکّہ چلائے۔ مگر یہ کام اُس وقت تک ملتوی کیا گیا۔ کہ درّانیوں کو ہزیمت دیکر اٹک پار بھگا دیں۔ اِس لئے مرہٹوں کا لشکر آگے بڑھا اور کنج پورہ کے قلعہ کو جہاں معدودے چند درّانی قابض و متصرّف تھے محصور کرلیا +

اِس وقت احمد شاہ درّانی گنگا کنارے **انوپ شہر** کے مقام پر چھاؤنی ڈالے پڑا تھا اور شجاع الدولہ کو اپنی رفاقت پر مائل کررہا تھا۔ مرہٹوں کی یورش کے اخبار وحشت آثار سُنکر اُس نے چھاؤنی توڑی اور محصورینِ کنج پورہ کی اعانت کے لئے برسبیل استعجال روانہ ہوا۔ باغپت کے گھاٹ اُس نے دریاے جمن کو عبُور کرنا چاہا۔ مگر دریا تھا طغیانی پر اور اسباب گزارہ مفقود۔ ناچار اَور آگے بڑھا اور کنج پورہ کے مُحاذات میں پُہنچکر اُس نے ایک تیر ترکش سے نکالا۔ اُس پر کچھ دم کرکے دریا میں پھینکا اور لشکر کو حکم دیا۔ کہ فوراً گھوڑے دریا میں ڈالدو۔ وہ خدا کے حکم سے تم کو رستہ دیگا۔ اِس تدبیر سے اُس کا سارا لشکر پار اُتر گیا۔ یہاں خبر لگی۔ کہ ایک دستہ فوج مرہٹہ کا **سنبھالکہ** کے سراے پر

قابض ہے۔ لہذا قشونِ دُرّانی کا ہراول اُن کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا۔ اور کامیاب ہوا۔ اگرچہ یہ چھوٹی سی فتح تھی۔ مگر درّانی لشکر اس کو فال فیروزی سمجھ کر بہت خوش ہوا +

اب درّانیوں کی آمد آمد سُنکر مرہٹوں نے بھی کنج پورہ سے کوسِ مراجعت بجایا اور دونوں لشکر نواحی پانی پت میں خیمہ زن ہوئے۔ مرہٹوں کے لاؤ لشکر کی بھیڑ بھاڑ اس قدر تھی۔ کہ آج تک نو لاکھ نیزہ زباں زدِ عوام ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ جنگ مہابھارت کے بعد سرزمین ہند میں ایسا جمگھٹ فوجوں کا کبھی نہیں ہوا۔ خیر یہ سب مبالغہ سہی۔ مگر اس میں شک نہیں۔ کہ مرہٹوں کی جمعیت مع بھیر و بنگاہ بقول بعض تین لاکھ اور بقول بعض پانچ لاکھ کے قریب تھی۔ خاص قشون درّانی چالیس ہزار اور ہندوستانی سرداروں کی ماتحت فوجیں پچاس ہزار تھیں۔ مرہٹوں کا توپخانہ دو سو توپوں سے زیادہ۔ مگر درّانیوں کی طرف صرف تیس توپیں تھیں +

کچھ عرصہ تک دونوں لشکر مقابل ہمدگر پڑے رہے اور چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ چنانچہ ایک بار بھاؤ کے حکم سے گوبند رائے بندیلہ ایک دستہ فوج کا لیکر رُہیلکھنڈ و اودھ پر تاخت کرنے کے لئے نکلا۔ ہندوستانی سرداروں نے یہ خبر شاہ درّانی کو پہنچائی۔ شاہ نے سردار عطائی خان کو جو قندھار سے تازہ وارد ہوا تھا۔ اُس کے مقابلہ کو روانہ کیا۔ سردار مذکور اپنے ماتحت سواروں اور کچھ رُہیلوں کو ساتھ لے

راتوں رات یلغار کرکے صبحدم گوبند رائے کی فوج پر ٹوٹ پڑا اور اُس کو تہس نہس کرکے گوبند رائے کا سر شام تک بادشاہ کے سامنے لا رکھا۔ گاہ بیگاہ رسد لانے والے گروہوں میں بھی جھڑپ ہو جاتی تھی +
غرض کئی مہینے تک پڑے پڑے طرفین کے سپاہی اور سردار تنگ آگئے۔ اِدھر تو ہندوستانی سردار احمد شاہ سے ملتجی ہوئے۔کہ ایک فیصلہ کی جنگ کیجیئے۔جو ہونا ہو سو ہو جائے۔ اُدھر مرہٹے سردار بھاؤ سے متقاضی تھے۔کہ لشکر میں غلّہ اور سامان کا قحط ہے۔ یوں فاقوں مرنے سے تو بہتر ہے۔کہ بر سرِ میدان لڑکر مریں +

آخر کار شجاع الدولہ کی وَساطت سے مرہٹوں نے صلح کا پیغام بھیجا۔ احمد شاہ نے جواب دیا۔کہ جنگ و پیگار کا معاملہ میری رائے پر رکھو اور صلح کرنی ہو۔تو تم لوگ مختار ہو۔ جو اپنے حق میں مصلحت سمجھو کرو۔ شجاع الدولہ تو صلح و آشتی پر مائل تھا۔ اِلّا نجیب الدولہ اڑ بیٹھا اور سب ہندوستانی سرداروں کو سمجھایا۔کہ اگر اس وقت مرہٹے کورے نکل گئے۔ تو یاد رکھنا۔کہ آیندہ تمھاری خیر نہیں۔غرض صلح کا معاملہ جھمیلے میں پڑ گیا۔ دو ٹوک فیصلہ قرار نہ پایا +

ابھی پیک و پیام آ جا رہے تھے۔کہ آخر شب کو جاسوسوں نے خبر دی۔کہ مرہٹوں کا لشکر ایک زبردست حملہ کی تیاری میں مصروف ہے۔یہ خبر شجاع الدولہ نے احمد شاہ کو پہنچائی۔وہ اپنے خیمہ سے ہتیار لگائے باہر آیا اور فوج کو آگے بڑھنے کا حکم سُنایا۔مگر شاہ کو اس خبر کی صحت میں

ہنوز تردد تھا- کہ یکایک مرہٹوں کے توپخانہ کی زبر دست فیر نے اُس کی تصدیق کردی +

جب مرہٹوں کا توپخانہ باآہستگی آگے بڑھتا چلا آیا- یہاں تک- کہ اُس کے گولے دُرّانی لشکر کے سر پر سے گزرنے لگے- تو مرہٹوں کے جنرل ابراہیم گردی نے فیر بند کرادی اور اپنی پلٹنوں کو آگے بڑھاکر سنگینوں سے حملہ کیا +

اِس حملہ نے روہیلوں کی صف کو جو دُرّانیوں کے بازوے راست کی محافظ تھی بالکل زیر و زبر کر دیا- اور اِس کے ساتھ ہی ایک تازہ دم فوج سے بسواس راؤ نے دُرّانیوں کے قلب لشکر پر جہاں احمد شاہ کا وزیر حکم رانی کر رہا تھا سخت یورش کی- اِس چپقلس میں وزیر کا برادر زادہ عطائی خان کام آیا اور دُرّانیوں کے قدم اُکھڑنے لگے یہ کیفیت دیکھکر وزیر اور اُس کے رُفقا گھوڑوں سے کود پڑے اور عزم بالجزم کرلیا- کہ بغیر مرے مارے میدان کو ہاتھ سے نہ دیں گے +

اِس وقت گرد و غبار کی وجہ سے ہنگامۂ نبرد کا کچھ حال معلوم نہ ہوتا تھا- کہ کون غالب اور کون مغلوب ہے ؟ مگر دُرّانیوں کے نعرے اور اُن کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ کم ہوتی جاتی تھی- اِس لئے احمد شاہ نے فوراً ایک دستہ وزیر کی کمک کے لئے عقب سے روانہ کیا- اُس کے پہنچتے ہی پھر گرما گرمی سے آتش جدال و قتال مشتعل ہوگئی اور خوب جمکر گھما گھمی سے لڑائی ہونے لگی- طرفین کے دلاور سورما دست بدست

اور سینہ بسینہ ڈٹ گئے۔کہیں تلوار سے تلوار اور کہیں کھانڈے سے کھانڈا بج رہا تھا۔نیزوں کی سنانیں اور سنگینوں کی نوکیں برقِ خاطف کے مانند کوند رہی تھیں۔ بھاؤ اور بسواس اپنی فوجوں کو بڑھا بڑھا کر مردانہ وار لڑا رہے تھے۔ظاہرا مرہٹوں کا پلہ بہت بھاری نظر آتا تھا اور دُرّانی دبتے چلے جاتے تھے۔مگر عین وقت پر احمد شاہ کو وہ چال سوجھی۔کہ طرفۃ العین میں بازی کا رنگ بدل گیا۔ اُس کی ہدایت کے مطابق سوارانِ صف شکن کا دستہ۔جو اُس کی فوج کا چیدہ حصّہ تھا۔گھوڑوں کو سرپٹ اُڑاتا۔کاوا کاٹ کر نکلا اور یکایک غنیم کے بائیں بازو پر نہایت جوش و خروش کے ساتھ ٹوٹ پڑا +

یہ حملہ نہ تھا بلکہ سحر و افسوں تھا۔جس کے اثر سے مرہٹوں کی دَل بادل فوجیں کائی کی طرح پھٹ گئیں۔کچھ ایسی ہل چل مچی۔کہ بالکل حواس باختہ ہوگئے اور جیتی جتائی بازی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔پھر تو دُرّانیوں اور رُہیلوں نے وہ بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے۔کہ کُشتوں کے پُشتے اور مقتولوں کے انبار لگا دئے۔بیس بیس کوس تک غنیم کا پیچھا دبائے چلے گئے اور جہاں مرہٹہ سپاہی پایا۔وہیں اُس کو ٹھکانے لگایا۔یہانتک کہ اسیرانِ جنگ پر بھی کچھ رحم نہ کیا۔جو اُن کی تیغ بے دریغ سے بچ نکلا۔اُس کو دہاقین نے سنگوایا۔بھاؤ۔بسواس اور دیگر چیدہ سردار مرہٹوں کے وہیں کھیت رہے۔صرف ہلکر اور سیندھیا زندہ بچے +

جب بقیۃ السیف اپنے ملک میں پہنچے ہیں۔تو تمام دکن میں گھر گھر

کہرام مچ گیا۔ کوئی قریہ اور قصبہ ایسا نہ تھا جہاں سے نالہ و فغاں کی صدا بلند نہ ہوئی ہو۔ ایسی خوفناک تباہی مرہٹوں پر کبھی نہ پڑی تھی۔ اور بعد ازاں پہلی سی شان و شوکت اُن کو کبھی نصیب نہ ہوئی + مورخین دقیقہ سنج نے مرہٹوں کی ہزیمت کا سبب یہ قرار دیا ہے۔ کہ وہ زور بازو و نیروے جسمانی میں خلقۃً اپنے حریف کے مد مقابل نہ تھے۔ اِس لئے شدائد جنگ و مصائب رزم کو زیادہ برداشت نہ کرسکے + (محمد اسمٰعیل)

میرزا رجب علی بیگ سرور

میرزا رجب علی بیگ نام۔ سرور تخلص۔ لکھنؤ کے رہنے والے۔ واجد علی شاہی دَور کے بڑے مشہور نثار مقفی نگار تھے۔ یہ طرزِ انشا جوکہ سراسر تکلّف تھی۔ اُس پُر تکلّف زمانہ میں چندے مقبول رہی۔ مگر اب تو بالکل مُردہ و افسردہ ہو گئی ہے +

جاڑے کی شدّت

ناگاہ ایک روز گزر موکبِ حشمت و جلال۔ با فر و شوکتِ کمال۔ ایک صحراے باغ و بہار دشتِ لالہ زار میں ہوا۔ فضاے صحرا قابلِ تحریر کیفیتِ دشتِ گلشن آسا لایقِ تقریر۔ بو باس ہر برگِ گُل کی رشکِ مشکِ اَذفر۔ صَفحۂ بیاباں مُعنبر و مُعطّر۔ چشموں کا پانی صفا میں آبِ گوہر سے آبدار تر۔ ذائقہ میں بہ از شیر و شکر۔ چلہ کے جاڑے کڑاکے کی سردی تھی۔ گویا کہ زمین سے آسمان تک یخ بھر دی تھی۔ پرند اور چرند اپنے اپنے آشیانوں اور کاشانوں میں جمے ہوئے بیٹھے۔ بھوک

اور پیاس کے صدمے اُٹھاتے تھے۔ دھوپ کھانے باہر نہ آتے تھے۔ قصد سے تھرتھراتے تھے۔ سردی سے سب کا جی جلتا تھا۔ دمِ تقریر ہر شخص کے مُنہ سے دُھواں دھار دھواں نکلتا تھا۔ آواز کسی کی کان تک کسی کے کم جاتی تھی۔ مُنہ سے بات باہر آئی اور جم جاتی تھی۔ مارِ سیاہ اُوس چاٹنے باہر نہ آتا تھا۔ سردی کے باعث دُم دبا کے بانبی میں بھاگ جاتا تھا۔ زمانہ کے کار و بار میں خلل تھا۔ ہر ایک دست در بغل تھا۔ اشکِ شمعِ انجمن لگن تک گرتے گرتے اولا تھا۔ پروانوں نے پھرتے پھرتے ٹٹولا تھا۔ شعلہ کانپتا تھا۔ فانوس کے لحاف میں مُنہ ڈھانپتا تھا۔ شمع کا جسم برف تھا۔ پگلنے کا کیا حرف تھا۔ ہر سنگ کے سینہ میں آگ تھی گواہ شرعی شررِ تھا۔ لیکن سردی کو بھی یہ لاگ تھی اور جاڑے کا ایسا اثر تھا۔ کہ سلیں کی سلیں جمی پڑی تھیں۔ فولاد سے زیادہ کڑی تھیں۔ تنورِ فلکِ چارم کی چھاتی سرد تھی۔ گلخن میں یہ برودت تھی کہ کشمیر گرد تھی۔ لُنجوں نے بٹیر پکڑی۔ لوے لولوں کے ہاتھ آئے۔ لنگڑے ہرن باندھ لائے۔ سر زمین ہند میں مُردے نہ جلتے تھے۔ زندوں کے ہاتھ پانوٗں گلتے تھے۔ آتشِ رُخسارِ گُل شبنم نے بجھائی تھی۔ باغ میں بھی جاڑے کی دُہائی تھی۔ اُوس برگ و بار کی صنعت پروردگار کی دکھاتی تھی۔ مُرصّع کاری یک لخت نظر آتی تھی۔ دانہ ہائے اشکِ شبنم خواہ بڑے یا ریزے تھے۔ ہر شجر کے پتّے اور شاخ میں الماس اور موتیوں کے آویزے تھے۔ عذار لالۂ حمرا رشکِ زعفراں تھا۔ طلائی

درختوں کی ٹہنیاں - کہربائی پتے - بہار میں رنگ خزاں تھا - اِس سردی کا کہیں ٹھکانا تھا - حمام تہ خانہ کا خس خانہ تھا - آگ پر لوگ جی نثار کرتے تھے - زردشت کا طریقہ اختیار کرتے تھے - آفتاب عازمِ برجِ حمل تھا - آتش پرستوں کا عمل تھا - زیست سمندر کے عنوان تھی - آگ میں خلقت کی جان تھی - جاڑے میں ہر ایک المست تھا - عالم اللہ کا آتش پرست تھا - جاڑے سے اُس دشت میں ایسا پالا پڑا - تمام اہلِ لشکر کو تپ لرزہ کا عالم تھا - بانکے ترچھے اینٹھے جاتے تھے - ڈھال تلوار کھڑکھڑانے کے عوض دانت کڑکڑاتے تھے - تمنچے - چقماق - پتھر کلے لاٹھی سے بیکار ہو گئے تھے - چانپ کے پتھر آگ نہ دیتے تھے - اور توڑے دار کا یہ حال تھا - بوجھ کندھا توڑے دیتا تھا - قدم اُٹھانا محال تھا - توڑا ہر ایک گُل تھا - توتے کی جگہ شورِ بلبل تھا - ہوش لوگوں کے کانپتے تھے - کینچوے کی مٹی کو الاؤ سمجھ پھونکتے ہانپتے تھے - ملایم لوگوں کے حواس جم گئے تھے - جگنو کو چنگاری کے دھوکے اُٹھانے کو تھم گئے تھے - سردی بسکہ کار فرما تھی - ایک کو دوسرے کی تمنّا تھی - یہاں تک جاڑے کا زور شور عالمگیر ہوا تھا - کہ کُرۂ نار زمہریر ہوا تھا +

(سرور لکھنوی)

میر اَمّن دہلوی

میر اَمّن دلّی کے رہنے والے تھے۔ بتلاش معاش چندے عظیم آباد میں قیام کیا۔ وہاں سے چلکر کلکتہ پُہنچے۔ جان گلگرسٹ کے حضور میں رسائی ہوئی۔ صاحب موصوف کی فرمائش سے ۱۸۰۱ء میں قصۂ چار درویش کو فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ ان کی نثر اُس زمانہ کے روز مرہ اُردو اور محاورات دہلی کا نہایت صحیح نمونہ ہے +

قصّہ

یہ کمترین بادشاہ زادہ عجم کا ہے۔ میرے ولی نعمت وہاں کے بادشاہ تھے اور سوائے میرے کوئی فرزند نہ رکھتے تھے۔ جوانی کے عالم میں مصاحبوں کے ساتھ چوپڑ۔ گنجفہ۔ شطرنج۔ تختہ نرد کھیلا کرتا یا سوار ہوکر سیر و شکار میں مشغول رہتا۔ ایک دن کا یہ ماجرا ہے۔ کہ سواری تیار کرواکر اور سب یاروں آشناؤں کو لیکر میدان کی طرف نکلا۔ باز۔ بہری۔ جرہ۔ باشہ۔ سرخاب اور تیتروں پر اُڑاتا ہوا دور نکل گیا۔ عجب طرح کا ایک قطعہ بہار کا نظر آیا۔ کہ جدھر نگاہ جاتی کوسوں تک سبزے اور پھولوں سے زمین لال نظر آتی تھی۔ یہ سماں دیکھکر گھوڑوں کی باگیں ڈال دیں اور قدم قدم سیر کرتے ہوئے چلے۔ ناگاہ اُس صحرا میں دیکھا۔ کہ ایک کالا ہرن۔ اُس پر زربفت کی جھول اور بھنور کلی مُرصّع کی اور گھنگرو سونے کے زردوری پٹّے میں ٹکے ہوے گلے میں پڑے خاطر جمع سے اُس میدان میں۔ کہ جہاں انسان کا دخل نہیں اور پرندہ پَر نہیں مارتا۔ چرتا پھرتا ہے۔ ہمارے گھوڑوں کے سُم کی آہٹ پاکر چوکنا

ہوا۔ سر اُٹھاکر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلا۔ مجھے اُس کے دیکھنے سے یہ شوق ہوا۔ کہ رفیقوں سے کہا۔ تم یہیں کھڑے رہو۔ میں اِسے جیتا پکڑونگا۔ خبردار! تم قدم آگے نہ بڑھائیو اور میرے پیچھے نہ آئیو۔ اور گھوڑا میری رانوں تلے ایسا پرند تھا۔ کہ بارہا ہرنوں کے اوپر دوڑاکر۔ اُن کی کرچھالوں کو بُھلاکر ہاتھوں سے پکڑ پکڑ لیتے تھے۔ اُس کے عقب دوڑایا۔ وہ دیکھکر چھلانگیں بھرنے لگا اور ہَوا ہوا۔ گھوڑا بھی باؤ سے باتیں کرتا تھا۔ لیکن اُس کی گرد کو نہ پہنچا۔ وہ رہوار پسینہ پسینہ ہوگیا اور میری بھی جیبھ مارے پیاس کے چٹخنے لگی۔ پر ہرگز کچھ بس نہ چلا۔ شام ہونے لگی اور میں کیا جانوں! کہاں سے کہاں نکل آیا؟ ناچار ہوکر اُس کو بُھلاوا دیا اور ترکش میں سے تیر نکال کر اور قربان سے کمان سنبھالکر چلّے میں جوڑ کشش کان تک لاکر ران کو اُس کی تاک "اللہ اکبر" کہکر مارا۔ بارے پہلا ہی تیر اُس کے پانوں میں ترازو ہوا۔ تب لنگڑاتا ہوا پہاڑ کے دامن کی سمت چلا۔ فقیر بھی گھوڑے پر سے اُتر پا پیادہ اُس کے پیچھے لگا۔ اُسی کوہ کا ارادہ کیا اور اُس کا ساتھ دیا۔ کئی اُتار چڑھاؤ کے بعد ایک گنبد نظر آیا۔ جب پاس پہنچا ایک باغیچہ اور ایک چشمہ دیکھا۔ وہ ہرن تو نظروں سے چھلاوہ ہوگیا۔ میں نہایت تھکا تھا۔ ہاتھ پانوں دھونے لگا۔ ایک بارگی آواز رونے کی اُس بُرج کے اندر سے میرے کان میں آئی۔ جیسے کوئی کہتا ہے۔ اے بچّے! جس نے تجھے تیر مارا میری آہ کا تیر اُس کے کلیجے میں لگیو۔ وہ اپنی جوانی سے پھل نہ پاوے اور خدا

اُس کو میرا سا دُکھیا بناوے۔ میں یہ سُنکر وہاں گیا۔ تو دیکھا۔ کہ ایک بزرگ ریش سفید اچھی پوشاک پہنے ایک مسند پر بیٹھا ہے اور ہرن آگے لیٹا ہے۔ اُس کی جانگ سے یہ تیر کھینچتا ہے اور بددعا دیتا ہے۔ میں نے سلام کیا اور ہاتھ جوڑکر کہا۔ کہ حضرت سلامت! یہ تقصیر نادانستہ اِس غلام سے ہوئی۔ خدا کے واسطے مُعاف کرو۔ بولا کہ بے زبان کو تو نے ستایا ہے۔ اگر انجان تجھ سے یہ حَرکت ہوئی۔ تو اللہ مُعاف کریگا۔ میں پاس جا بیٹھا۔ اور تیر نکالنے میں شریک ہوا۔ بڑی دقّت سے تیر کو نکالا۔ اور زخم میں مرہم بھرکر چھوڑ دیا۔ پھر ہاتھ دھو دھاکر اُس پیر مرد نے حاضری جو اُس وقت موجود تھی مجھے کھلائی۔ میں نے کھا پی کر ایک چارپائی پر لمبی تانی۔ ماندگی کے سبب خوب پیٹ بھرکر سویا۔ اُس نیند میں آواز نوحہ و زاری کی کان میں آئی۔ آنکھیں ملکر جو دیکھتا ہوں۔ تو نہ اُس مکان میں وہ بوڑھا ہے۔ نہ کوئی اَوْر ہے۔ اکیلا میں ایک پلنگ پر لیٹا ہوں اور وہ دالان خالی پڑا ہے +

(میر اَمَّن دہلوی)

تمام شد حصۂ نثر

حصّۂ نظم

مثنویات

از خواجہ الطاف حسین حالی

حُبِّ وطن

اے سپہرِ بریں کے سیّارو!
اے فضائے زمیں کے گلزارو!

اے پہاڑوں کی دلفریب فضا!
اے لبِ جو کی ٹھنڈی ہوا!

اے عنادل کے نغمۂ سحری!
اے شبِ ماہتاب تاروں بھری!

اے نسیمِ بہار کے جھونکو!
دہرِ ناپائدار کے دھوکو!

تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز
تھے وطن میں مگر کچھ اَور ہی چیز

جب وطن میں ہمارا تھا رمنا
تم سے دل باغ باغ تھا اپنا

تم مری دل لگی کے ساماں تھے
تم مرے درد دل کے درماں تھے

تم سے کٹتا تھا رنجِ تنہائی
تم سے پاتا تھا دل شکیبائی

آن اِک اِک تمھاری بھاتی تھی
جو ادا تھی وہ جی لُبھاتی تھی

کرتے تھے جب تم اپنی غمخواری
دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری

جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے / ہو کے خوش حال۔ گھر میں آتے تھے
بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لبِ آب / دھو کے اُٹھتے تھے دل کے داغ شتاب
کوہ و صحرا و آسمان و زمیں / سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں
پر چھُٹا جب سے اپنا مُلک و دیار / جی ہوا تم سے خود بخود بیزار
نہ گُلوں کی ادا خوش آتی ہے / نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے
سیرِ گلشن ہے جی کا اِک جنجال / شبِ مہتاب جان کو ہے وبال
کوہ و صحرا سے تا لبِ دریا / جس طرف جائیں جی نہیں لگتا
کیا ہوے وہ دن اور وہ راتیں / تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں
ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اَور / یا تمھارے ہی کچھ بدل گئے طور
گو وہی ہم ہیں اور وہی دنیا / پر نہیں ہم کو لُطف دُنیا کا
اے وطن! اے مرے بہشتِ بریں! / کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں؟
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا / وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
تیری دوری ہے موردِ آلام / تیرے چھُٹنے سے چھُٹ گیا آرام
کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے / گُل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے
مِٹ گیا نقش کامرانی کا / تجھ سے تھا لُطف زندگانی کا
جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا / اُن کو کیا ہوگا زندگی کا مزا
ہو گیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال / تجھ بن ایک ایک پل ہے اِک اِک سال
سچ بتا۔ تو سبھی کو بھاتا ہے / یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے
میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار / یا کہ سب تجھ پہ ہیں فدا اے یار!

کیا زمانے کو تو عزیز نہیں — اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں
جن و انسان کی حیات ہے تو — مُرغ و ماہی کی کائنات ہے تو
ہے نباتات کو نمو تجھ سے — رُوکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے
سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو و نما — سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا
تیری اک مُشتِ خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز۔ اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جُدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جُدا
اے دل! اے بندۂ وطن! ہُشیار! — خوابِ غفلت سے ہو ذرا بیدار
او نشاطِ خودی کے متوالے! — گھر کی چوکھٹ کے چومنے والے
نام ہے کیا اِسی کا حُبِّ وطن! — جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کبھی بچّوں کا دھیان آتا ہے — کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے
یاد آتا ہے اپنا شہر کبھی — لَو کبھی اہلِ شہر کی ہے لگی
نقش ہیں دل پہ کوچہ و بازار — پھرتے آنکھوں میں ہیں در و دیوار
کیا وطن کی یہی محبّت ہے — یہ بھی اُلفت میں کوئی اُلفت ہے
اِس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند — اِس سے خالی نہیں چرند و پرند
ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں — سوکھ جاتے ہیں روکھ فرقت میں
جاکے کابل میں آم کا پودا — کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا
آکے کابل سے یاں بہی و انار — ہو نہیں سکتے بارور زنہار
مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے — ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے
آگ سے جب ہوا سمندر دور — اُس کو جینے کا پھر نہیں مقدور

گھوڑے جب کھیت سے بچھڑتے ہیں
جان کے اُن کی لالے پڑتے ہیں

گائے یا بھینس اونٹ یا بکری
اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی

کہئے حُبِّ وطن اسی کو اگر
ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کمتر

بیٹھے بے فکر کیا ہو- ہموطنو!
اُٹھو- اہلِ وطن کے دوست بنو

مرد ہو- تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ- پیو- چلے جاؤ

جب کوئی زندگی کا لطف اُٹھاؤ
دل کو دُکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ

پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک
کرو دامن سے تا گریباں چاک

کھانا کھاؤ- تو جی میں تم شرماؤ
ٹھنڈا پانی پیو- تو اشک بہاؤ

کتنے بھائی تمھارے ہیں نادار
زندگی سے ہے جن کا دل بیزار

نوکروں کی تمھارے جو ہے غذا
اُن کو وہ خواب میں نہیں ملتا

جس پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو
واں مُیسّر نہیں وہ اوڑھنے کو

کھاؤ- تو پہلے لو خبر اُن کی
جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی

پہنو- تو پہلے بھائیوں کو پنھاؤ
کہ ہے اُترن تمھاری جن کا بناؤ

ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر
ہے کوئی اُن میں خشک کوئی تر

سب کو ہے ایک اصل سے پیوند
کوئی آزردہ ہے کوئی خرسند

مُقبلو! مدبروں کو یاد کرو
خوشدلو! غم زدوں کو شاد کرو

جاگنے والو! غافلوں کو جگاؤ
تیرنے والو! ڈوبتوں کو تراؤ

ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر
لو جو لی جائے کور و کر کی خبر

(حالی)

برکھا رت

گرمی کی تپش بجھانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان
وہ شاخ و درخت کی جوانی
وہ سارے برس کی جان برسات
آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
ہے ابر کی فوج آگے آگے
ہیں رنگ برنگ کے رسالے
ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی
جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے
توپوں کی ہے جبکہ باڑ چلتی
مینہ کا ہے زمین پر ڈیڑا
بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی
گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی
سورج نے نقاب لی ہے مُنہ پر
باغوں نے کیا ہے غُسلِ صحّت

سردی کا پیام لانے والی
عارف کے لئے کتابِ عرفان
وہ مور و ملخ کی زندگانی
وہ کون ؟ خدا کی شان برسات
اور سینکڑوں التجاؤں کے بعد
اِک شور ہے آسماں پہ برپا
اور پیچھے ہیں دَل کے دَل ہوا کے
گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے
ایک آتی ہے۔ فوج ایک جاتی
ہمراہ ہیں لاکھوں توپخانے
چھاتی ہے زمین کی دہلتی
گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا
آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی
جنّت کی ہوائیں آ رہی ہیں
قدرت ہے نظر خدا کی آتی
اور دھوپ نے تہ کیا ہے بستر
کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت

سبزہ سے ہے کوہ و دشت معمور ہے چار طرف برس رہا نور
ٹبیا ہے نہ ہے سڑک نمودار اٹکل سے ہیں راہ چلتے رہوار
ہے سنگ و شجر کی ایک وردی عالم ہے تمام لاجوردی
پھولوں سے پٹے ہوے ہیں کہسار دولھا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے "پیہو پیہو" اور مور جھنگارتے ہیں ہر سو
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
مینڈک ہیں جو بولنے پہ آتے سنسار کو سر پہ ہیں اُٹھاتے
سب خوانِ کرم سے حق کے ہیں سیر پانی میں مگر۔ کچھار میں شیر
زردار ہیں اپنے مال میں مَست فلاّنچ ہیں اپنی کھال میں مَست
ابر آیا ہے گھر کے آسماں پر کلمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر

(حالی)

از مثنوی سحر البیان مصنفۂ میر حسن دہلوی

میر غلام حسن نام۔ حسن تخلّص شرفاے دہلی سے تھے۔ فن سخن میں میر درد اور میرزا سودا سے مشورہ کرتے تھے۔ ایاّم شباب میں دلّی سے فیض آباد آئے۔ پھر لکھنؤ۔ وہیں یہ مثنوی لکھی۔ جس سے بہتر اُردو میں کوئی مثنوی نہیں ہوئی۔ بیان سادہ پُر تاثیر اور محاورہ کی خوبیوں سے معمور۔ جس معاملہ کو بیان کیا ہے اُس کی تصویر کھینچ دی ہے +

کروں پہلے توحیدِ یزداں رقم جھکا جس کے سجدہ کو اوّل قلم
سرِ لوح پر رکھ بیاضِ جبیں کہا دوسرا کوئی تجھ سا نہیں
قلم پھر شہادت کی اُنگلی اُٹھا ہوا حرف زن یوں کہ ربّ العُلا

نہیں کوئی تیرا۔ نہ ہو گا شریک ‏ تری ذات ہے وَحدَہٗ لَا شَرِیک
پرستش کے قابل ہے تو۔ اے کریم! ‏ کہ ہے ذات تیری غفورٌ الرّحیم
رہِ حمد میں تیری عَزَّ وَ جَل! ‏ تجھے سجدے کرتا چلوں سر کے بل
وہ الحق۔ کہ ایسا ہی معبود ہے ‏ قلم جو لکھے۔ اُس سے افزود ہے
تر و تازہ ہے اُس سے گلزارِ خلق ‏ وہ ابرِ کرم ہے ہوا دارِ خلق
اگرچہ وہ بے فکر غیوّر ہے ‏ ولے پرورش سب کی منظور ہے
کسی سے بر آوے نہ کچھ کامِ جاں ‏ جو وہ مہرباں ہو۔ تو کُل مہرباں
نہاں سب میں اور سب میں ہے آشکار ‏ یہ سب اُس کے عالم ہیں ہژدہ ہزار
اُسی سے ہے کعبہ۔ اُسی سے کنشت ‏ اُسی کا ہے دوزخ۔ اُسی کا بہشت
وہ ہے مالک الملک دنیا و دیں ‏ ہیں قبضہ میں اُس کے زمان و زمیں
نہیں اُس سے خالی غرض کوئی شے ‏ وہ کچھ شے نہیں۔ پر ہر اک شے میں ہے
نہ گوہر میں ہے وہ۔ نہ ہے سنگ میں ‏ ولیکن چمکتا ہے ہر رنگ میں
تامّل سے کیجے اگر غور کچھ ‏ تو سب کچھ وہی ہے۔ نہیں اور کچھ
دیا عقل و ادراک اُس نے ہمیں ‏ کیا خاک سے پاک اُس نے ہمیں

وصفِ سخن

پلا مجھ کو ساقی شرابِ سخن ‏ کہ ہو جس سے مفتوح بابِ سخن
سخن کی مجھے فکر دن رات ہے ‏ سخن ہی تو ہے۔ اَور کیا بات ہے
سخن کے طلبگار ہیں عقلمند ‏ سخن سے ہے نامِ نکویاں بلند
سخن کی کریں قدر مردانِ کار ‏ سخن نام اُن کا رکھے برقرار

سخن سے وہی شخص رکھتے ہیں کام — جنہیں چاہئے ساتھ نیکی کے کام
سخن سے سلف کی بھلائی رہی — زبانِ قلم سے بڑائی رہی
کہاں رستم و گیو و افراسیاب — سخن سے رہی یاد یہ نقلِ خواب
سخن کا صِلہ یار دیتے رہے — جواہر سدا مول لیتے رہے
سخن کا سدا گرم بازار ہے — سخن سنج اُس کا خریدار ہے
رہے جب تلک داستانِ سخن — الٰہی! رہیں قدر دانِ سخن

سواری کی طیّاری

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی — کھلی گُل جھڑی غم کے جنجال کی
کہا شہ نے بُلوا نقیبوں کو شام — کہ ہوں صبح حاضر سبھی خاص و عام
سواری تکلّف سے تیّار ہو — مہیّا کریں - جو کہ درکار ہو
کریں شہر کو مِل کے آئینہ بند — سواری کا ہو لُطف جس سے دوچند
رعیّت کے خوش ہوں صغیر و کبیر — کہ نکلیگا کل شہر میں بے نظیر
یہ فرما۔ محل میں گئے بادشاہ — نقیبوں نے سُن حکم۔ لی اپنی راہ
خوشی میں گئی جلد جو شب گزر — ہوئی سامنے سے نمایاں سحر
عجب شب تھی وہ جوں سحر رو سفید — عجب روز تھا مثلِ روزِ اُمید
کہا شاہ نے اپنے فرزند کو — کہ بابا! نہا دھو کے تیّار ہو
ہوا جب کہ داخل وہ حمّام میں — عرق آگیا اُس کے اندام میں
تنِ نازنیں نم ہوا اُس کا گُل — کہ جس طرح ڈوبے ہے شبنم میں گُل
نہا دھو کے نکلا وہ گُل اس طرح — کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح

غرض شاہزادہ کو نہلا دُھلا — دیا خِلعتِ خُسروانہ پنھا
نکل گھر سے جس دم ہوا وہ سوار — کئے خوان گوہر کے اُس پر نثار
زبس تھا سواری کا باہر ہجوم — ہوا جب کہ ڈنکا پڑی سب میں دھوم
برابر برابر کھڑے تھے سوار — ہزاروں ہی تھیں ہاتھیوں کی قطار
وہ ماہی مراتب۔ وہ تختِ رواں — وہ نوبت۔ کہ دولھا کا جیسے سماں
وہ شہنائیوں کی صدا خوش نما — سُہانی وہ نوبت کی دھیمی صدا
وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقّارچی — قدم با قدم۔ با لباسِ زری
سوار اور پیادے۔ صغیر و کبیر — جِلو میں تمامی امیر و وزیر
ہوے حکم سے شاہ کے پھر سوار — چلے سب قرینہ سے باندھے قطار
سجے اور سجائے سبھی خاص و عام — لباسِ زری میں مُلبّس تمام
غرض اِس طرح سے سواری چلی — کہے تو۔ کہ بادِ بہاری چلی
رعیّت کی کثرت۔ ہجومِ سپاہ — گزرتی تھی رُک رُک کے ہر جا نگاہ
لگا گُنج سے تا ضعیف و نحیف — تماشے کو نکلے وضیع و شریف
نظر جس کو آیا وہ ماہِ تمام — کیا اُس نے جُھک جُھک کے اُس کو سلام
غرض شہر سے باہر اِک سمت کو — کوئی باغ تھا شہ کا اُس میں سے ہو
سواری کو پہنچا گئی فوج اِدھر — گئے اپنی منزل پہ شمس و قمر
پہر رات تک پہنے پوشاک وہ — رہا ساتھ سب کے طربناک وہ
قضارا وہ شب تھی شبِ چاردہ — پڑا جلوہ لیتا تھا ہر طرف مہ
نظارہ سے تھا اُس کے دل کو سُرور — عجب عالمِ نور کا تھا ظہور

عجب لطف تھا سیرِ مہتاب کا — کہے تو۔ کہ دریا تھا سیماب کا
کچھ آئی جو اُس مہ کے جی میں ترنگ — کہا۔ آج کوٹھے پہ بچھے پلنگ
ارادہ ہے کوٹھے پہ آرام کا — کہ بھایا ہے عالم لبِ بام کا
زبس نیند میں تھا جو وہ ہو رہا — بچھونے پہ آتے ہی بس سو رہا
جہاں تک کہ چوکی کے تھے باریدار — ہوا جو چلی سو گئے ایک بار

شہزادہ گُم ہوگیا

کھُلی آنکھ جو ایک کی واں کہیں — تو دیکھا کہ وہ شاہزادہ نہیں
نہ ہے وہ پلنگ اور نہ وہ ماہ رو — نہ وہ گُل ہے اُس جا۔ نہ وہ اُس کی بو
نہ بن آئی کچھ اُن کو اِس کے سوا — کہ کہئے یہ احوال اب شہ سے جا
ہوا گُم وہ یوسف۔ پڑی یہ جو دھوم — کیا خادمانِ محل نے ہجوم
شب آدھی وہ جس طرح سوتے کٹی — رہی تھی جو باقی۔ سو روتے کٹی
عجب طرح کی شب تھی ہیہات وہ — قیامت کا دن تھا۔ نہ تھی رات وہ
سحر نے کیا جب گریبان چاک — اُڑانے لگے مل کے سب سر پہ خاک
اُٹھا شہر میں سب طرف شور غُل — کہ غائب ہوا اس چمن سے وہ گُل
غم و درد سے دل جو سب کا بھرا — ہوا باغ سارا وہ ماتم سرا
وہ لبریز جو نہر تھی جابجا — سو آنکھوں کو وہ رہ گئی ڈبڈبا
ہوا حال چشموں کا یاں تک تباہ — کیا رخت پانی سے اپنا سیاہ
کہاں وہ کنوئیں اور کدھر آبشار! — کوئی دل میں روئے کوئی دھاڑ مار
جہاں رقص کرتے تھے طاؤسِ باغ — لگے بولنے اُن منڈیروں پہ زاغ

منقش جہاں تھے وہ رنگیں مکاں
ہوے سب وہ جوں دیدۂ خوں چکاں

گلوں کی طرح کھل رہے تھے جو دِل
سو وہ سب خزاں سے ہوے مضمحل

نہ غنچہ - نہ گُل - نے گلستاں رہا
فقط دل میں اِک خارِ ہجراں رہا

وزیروں نے دیکھا جو احوالِ شاہ
کہ ہوتی ہے اب اُس کی حالت تباہ

کہا گو جدائی گوارا نہیں
ولیکن خدائی سے چارا نہیں

خدا کی خدائی تو معمور ہے
غرض اُس کے نزدیک کیا دور ہے

یہ کہہ اور شہ کو بٹھا تخت پر
بہر نوع رہنے لگے یک دگر

لٹایا بہت باپ نے مال و زر
ولیکن نہ پائی کچھ اُس کی خبر

شادی کا سماں

بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز
چڑھا بیاہنے وہ مہِ شب فروز

محل سے نکل جب ہوا وہ سوار
بجے شادیانے بہم ایک بار

کوئی دوڑ گھوڑوں کو لانے لگا
کوئی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا

سپر اور قبضے کھڑکنے لگے
سواروں کے گھوڑے بھڑکنے لگے

ٹکورے وہ نوبت کے اور اُن کے بعد
گرجنا وہ دھوسوں کا مانند رعد

دورستہ جو روشن چراغاں ہوئے
تلنگے خوشی سے غزل خواں ہوئے

براتی اِدھر اور اُدھر جوق جوق
وہ آوازِ سرنا و آوازِ بوق

وہ ابرک کی ٹٹّی وہ مینے کے جھاڑ
کہے تو - کہ تنکے کی اوجھل پہاڑ

دورستہ برابر برابر وہ تخت
کسی پر کنول اور کسی پر درخت

اناروں کا دغنا بھچنپے کا زور
ستاروں کا چھٹنا پٹاخوں کا شور

وہ مہتاب کا چھوٹنا بار بار ۔ ہر اک رنگ کی جس سے دونی بہار
جب آئی وہ دُلہن کے گھر پر برات ۔ کہوں واں کے عالم کی کیا تجھ سے بات!
بلوریں دھرے شمعداں بے شمار ۔ چڑھیں بتیاں موم کی چار چار
نئے رنگ کے اور نئے طور کے ۔ دھرے ہر طرف جھاڑ بلور کے
تماشائیوں کی یہ کثرت۔ کہ بس ۔ ملے ایک سے ایک سب پیش و پس
وہ دولھا کا مسند پہ جا بیٹھنا ۔ برابر رفیقوں کا آ بیٹھنا
ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان ۔ پلا سب کو شربت دئے پاندان
وہ سب ہو چکے جب کہ رسم و رسوم ۔ سواری کی ہونے لگی پھر تو دھوم
سحر کا وہ ہونا۔ وہ ٹونے کا وقت ۔ وہ دُلہن کی رخصت۔ وہ رونے کا وقت
وہ دُلہن کا رو رو کے ہونا جُدا ۔ وہ ماں باپ کا اَور رونا جُدا
نکلتے وہ جانا محل سے جہیز ۔ کہ جوں چشم سے اشک ہو موج خیز
یہاں موت ہے اہلِ عرفان کو ۔ کہ جانا ہے اِک دن یوہیں جان کو
وہ جو درد مندی سے ہیں آشنا ۔ وہ شادی کا لیتے ہیں غم سے مزا

شہزادہ کا ملنا

پڑا شہر میں یک بیک پھر یہ غل ۔ کہ غائب ہوا تھا سو آیا وہ گُل
خبر یہ ہوئی جب کہ ماں باپ کو ۔ کیا گُم اُنھوں نے وُہیں آپ کو
لگے رونے آپس میں زار و نزار ۔ کہا۔ ہائے! ہم کو نہیں اِعتبار
کہا سب نے صاحب! چلو تو سہی ۔ یہ بیٹا تمھارا وہی ہے! وہی!
مکرّر سُنا جب کہ بیٹے کا ناؤں ۔ چلا پھر تو روتا ہوا ننگے پاؤں

جوہیں اپنے کعبہ کو دیکھا رواں — چلا سر کے بل بے نظیرِ جہاں
گرا پانوں پر کہہ کے یہ باپ کے — "خدا نے دکھائے قدم آپ کے"
سُنی یہ صدا جوہیں اُس ماہ کی — تو اُس غم رسیدہ نے اِک آہ کی
ملے پھر تو آپس میں وہ خوب سے — کہ یوسف ملے جیسے یعقوب سے
ہوے شاد و خرّم صغیر و کبیر — چلے لیکے نذریں امیر و وزیر
مۓ عیش سے سب کو مستی ہوئی — نئے سر سے آباد بستی ہوئی
در آمد ہوا گھر میں سروِ رواں — لئے ساتھ اپنے وہ غنچہ دہاں
کہ اِتنے میں آگے نظر جو پڑی — تو دیکھا۔ کہ ہے راہ میں ماں کھڑی
بہی چشم سے آنسوؤں کی قطار — گرا ماں کے پانوں پہ بے اختیار
وہ ماں خوب بیٹے کے لگ کر گلے — یہ روئۓ۔ کہ آنسو کے نالے چلے
بہو اور بیٹے کو چھاتی لگا — وہ دونوں کی دو ہاتھ سے لی بلا
ہوئی جان اور جی سے اُن پر نثار — پیا پانی اُن دونوں پر وار وار
وہ آنکھیں جو اندھی تھیں۔ روشن ہوئیں — زمینیں جو تھیں خشک۔ گلشن ہوئیں
زبس باپ ماں کو تھی سہرہ کی چاہ — دوبارہ اُنھوں نے کیا اُس کا بیاہ
بنا اُن کی تقدیر کا جو بناؤ — نکالے اُنھوں نے یہ سب دل کے چاؤ
ہوا شہر پر فضلِ پروردگار — وہی شاہزادہ۔ وہی شہریار
وہی بلبلیں اور وہی بوستاں — شگفتہ گُل و مجمعِ دوستاں

(حسن دہلوی)

از مثنوی گلزار نسیم

پنڈت دیا شنکر متخلص بہ نسیم سرکار اودھ کی فوج میں منشی تھے اور فن سخن میں خواجہ آتش کے شاگرد۔ قصۂ گُلِ بکاؤلی جو پہلے نثر میں تھا۔ اُس کو نظم کرکے گلزار نسیم نام رکھا تشبیہ و استعارہ اور صنائع لفظی و معنوی سے بیان کو آراستہ اور قصہ کو مختصر کیا ہے میر حسن کی مثنوی کے بعد یہ ہی مثنوی ہے۔ جو مقبول عام ہوئی +

۱

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری	ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر	حمدِ حق و مدحتِ پیمبر
پانچ اُنگلیوں میں یہ حرف زن ہے	یعنی کہ مُطیع پنجتن ہے
ختم اِس پہ ہوئی سخن پرستی	کرتا ہے زباں کی پیش دستی

۲

رو دادِ زمانِ پاستانی	یوں نقل ہے خامہ کی زبانی
پورب میں ایک تھا شہنشاہ	سلطان زین الملوک ذیجاہ
لشکرکش و تاجدار تھا وہ	دشمن کُش و شہریار تھا وہ
خالق نے دئے تھے چار فرزند	دانا - عاقل - ذکی - خردمند
نقشہ ایک اَور نے جمایا	پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا
تھا افسرِ خسرواں وہ گلفام	پالا تاجُ الملوک رکھ نام
پردہ سے نہ دایہ نے نکالا	پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا
جب نامِ خدا جواں ہوا وہ	مانندِ نظر رواں ہوا وہ

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ	نظارہ کیا پسر کو ناگاہ
مُہرِ لبِ شہ ہوئی خموشی	کی نور بصر سے چشم پوشی
دی آنکھ جو شہ نے رونمائی	چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی
ہرچند کہ بادشہ نے ٹالا	اُس ماہ کو شہر سے نکالا
گھر گھر یہی ذکر تھا یہی شور	خارج ہوا نورِ دیدۂ کور
آیا کوئی لیکے نسخۂ نور	لایا کوئی جا کے سُرمۂ طور
تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور	بینا نہ ہوا وہ دیدۂ کور
ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے	مختار ہے جس طرح نباہے

۳

تھا اِک کحّال پیر دیریں	عیسیٰ کی تھیں اُس نے آنکھیں دیکھیں
وہ مردِ خدا بہت کراما	سلطاں سے ملا۔ کہا۔ کہ شاہا !
ہے باغ بکاؤلی میں اِک گُل	پلکوں سے اُسی پے مار چنگل
خورشید میں یہ ضیا کرن کی	ہے مہر گیا اُسی چمن کی
اُس نے تو گُلِ ارم بتایا	لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا
شہزادے ہوے وہ چاروں تیار	رخصت کئے شہ نے چارناچار
شاہانہ چلے وہ لیکے ہمراہ	لشکر۔ اسباب۔ خیمے۔ خرگاہ

۴

وہ بادیہ گردِ خانہ برباد	یعنی تاجُ الملوکِ ناشاد
میدان میں خاک اُڑا رہا تھا	دیکھا۔ تو وہ لشکر آرہا تھا

پوچھا۔ تم لوگ خیل کے خیل
جاتے ہو کدھر کو صورتِ سیل

بولا لشکر کا اِک سپاہی
"جاتی ہے ارم کو فوجِ شاہی"

سُلطان زین الملوکِ شہ زور
دیدارِ پسر سے ہوگیا کور

منظور علاجِ روشنی ہے
مطلوب گُلِ بکاؤلی ہے

گُل کی جو خبر سُنائی اُس کو
گلشن کی ہَوا سمائی اُس کو

ہمرہ کسی لشکری کے ہوکر
قسمت پہ چلا وہ نیک اختر

اِک چند پھرا کیا وہ انبوہ
صحرا صحرا و کوہ در کوہ

بلبل ہوئے سب ہزار جی سے
گُل کا نہ پتا لگا کسی سے

۵

وہ دامنِ دشتِ شوق کا خار
یعنی تاجُ الملوکِ دل زار

دَرویش تھا بندۂ خدا وہ
اللہ کے نام پر چلا وہ

اِک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد
صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد

سایہ کو پتا نہ تھا شجر کا
عَنقا تھا نام جانور کا

مُرغانِ ہَوا تھے ہوشِ راہی
نقشِ کفِ پا تھے ریگ ماہی

وہ دشت۔ کہ جس میں پُر تگ و دَو
یا ریگِ رواں تھا یا وہ رہرو

ڈانڈا تھا ارم کے بادشا کا
ایک دیو تھا پاسباں بلا کا

بھوکا کئی دن کا تھا وہ ناپاک
فاقوں سے رہا تھا پھانک کر خاک

حلوے کی پکا کر اِک کڑھائی
شیرینی دیو کو چڑھائی

کہنے لگا۔ کیا مزا ہے دلخواہ!
اے آدمی زاد واہ وا واہ!

چیز اچھی کھلائی تو نے مجھ کو
کیا اس کے عوض میں دوں میں تجھ کو

بولا وہ۔ کہ پہلے قول دیجے
پھر جو میں کہوں قبول کیجے

گلزارِ ارم کی ہے مجھے دُھن
بولا وہ ارے بشر! وہ گلبن

خورشید کے ہم نظر نہیں ہے
اندیشہ کا واں گزر نہیں ہے

رہ جا! مرا بھائی ایک ہے اَور
شاید کچھ اُس سے بن پڑے طور

حال اُس سے کہا۔ کہ قول ہارا
ہے پیر یہ نوجواں ہمارا

مشتاق ارم کی سیر کا ہے
کوشش کرو۔ کام خیر کا ہے

حمالہ نام دیونی ایک
چھوٹی بہن اُس کی تھی بڑی نیک

خط اُس کو لکھا بایں عبارت
"اے خواہرِ مہرباں سلامت!

"پیارا ہے مرا یہ آدمی زاد
رکھیو اسے جس طرح مری یاد"

"انسان ہے چاہیے کچھ جو سازش
مہمان ہے کیجیو نوازش"

"باپ اس کا ہے اندھے پن سے مجہول
مطلوب بکاؤلی کا ہے پھول"

"دل داغ اس کا برائے گُل ہے
نرگس کے لئے ہوائے گُل ہے"

خط لیکے بشر کو لے اُڑا دیو
پہنچا حمالہ پاس بے ریو

بھائی کا جو خط بہن نے پایا
بھیجے ہوئے کو گلے لگایا

دیوؤں سے کہا۔ کہ چوہے بنجاؤ
تا باغِ ارم سرنگ پہنچاؤ

سُن حاجتِ نقب بہرِ گلگشت
کترا چوہوں نے دامنِ دشت

جب مہر تہِ زمیں سمایا
اُس نقب کی رہ وہ آدم آیا

کھٹکا جو نگاہبانوں کا تھا
دھڑکا یہی دل کا کہہ رہا تھا

گوشہ میں کوئی لگا نہ ہووے! — خوشہ کوئی تاکتا نہ ہووے!
گو باغ کے پاسباں غضب تھے — خوابیدہ برنگِ سبزہ سب تھے
پانی کے جو بلبلوں میں تھا گُل — پہنچا لبِ حوض سے نہ چنگل
پوشاک اُتار اُتر کے لایا — پھولا نہ وہ جامہ میں سمایا
گُل لیکے بڑھا ایاغ برکف — چوری سے چلا چراغ برکف
گُل ہاتھ میں مثلِ دستِ بیضا — اُس نقب کی آستیں سے نکلا
گُل لیکے جب آ ملا وہ گلچیں — اُس نقب کی رخنہ بندیاں کیں

۶

گلچیں نے وہ پھول جب اُڑایا — اور غنچۂ صبح کھلکھلایا
وہ سبزۂ باغِ خوابِ آرام — یعنی وہ بکاؤلی گُل اندام
جاگی مرغِ سحر کے غل سے — اُٹھی نکہت سی فرشِ گُل سے
مُنہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پُر آب وہ چشمِ حوض پائی
دیکھا تو۔ وہ گُل ہَوا ہوا ہے — کچھ اَور ہی گُل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل — جھنجلائی۔ کہ کون دیگیا جُل؟
ہَیْ ہَیْ! مرا پھول لے گیا کون؟ — ہَیْ ہَیْ! مجھے خار دے گیا کون؟
ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے — بو ہوکے تو گُل اُڑا نہیں ہے
اپنوں میں سے پھول لیگیا کون؟ — بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون؟
شبنم کے سوا چُرانے والا — اوپر کا تھا کون آنے والا؟
جس کف میں وہ گُل ہو۔ داغ ہو جائے! — جس گھر میں ہو۔ گُل چراغ ہو جائے؟

آنکھوں سے عزیز گُل مرا تھا
پُتلی وُہی چشمِ حوض کا تھا

گلچیں کا جو ہاے! ہاتھ ٹوٹا
غنچہ کے بھی مُنہ سے کچھ نہ پھوٹا

او خار پڑا نہ تیرا چنگل
مشکیں کس لیں نہ تونے سنبل؟

او بادِ صبا ہَوا نہ بتلا
خوشبو ہی سُنگھا پتا نہ بتلا؟

بلبل تو چہک اگر خبر ہے؟
گُل تو ہی مہک سُنگھا کدھر ہے؟

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام
تھی سبزہ سے راست مو بر اندام

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا
جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

رنگ اُس کا غرض لگا بدلنے
گُل برگ سے کف لگی وہ ملنے

گُل کا سا لہو بھرا گریباں
سبزہ کا سا تار تار داماں

دکھلا کے کہا سمن پری کو
اب چین کہاں! بکاؤلی کو!

تھی بسکہ غبار سے بھری وہ
آندھی سی اُٹھی۔ ہَوا ہوئی وہ

ہر باغ میں پھولتی پھری وہ
ہر شاخ میں جھولتی پھری وہ

جس تختہ میں مثلِ باد جاتی
اُس رنگ کے گُل کی بو نہ پاتی

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے
پتّا کہیں حکم بن ہلا ہے؟

(نسیم لکھنوی)

از مثنوی میر تقی

محمد تقی نام میر تخلص - شرفائے اکبرآباد سے تھے - دلّی پہنچکر اُن کی شاعری نے شہرت پائی - شعرائے ماضی و حال نے اُن کو غزل گوئی کا امام مانا ہے - مثنویاں بھی اچھی ہیں مگر قصیدہ پھیکا - کلام اُن کا نہایت صاف و شستہ اور پُر اثر ہے - آخر عمر میں لکھنؤ چلے گئے تھے - سو برس کے ہوکر ۱۲۲۵ھ میں راہی ملکِ بقا ہوئے - درد - سودا - مصحفی - انشا اور جرأت کے ہمعصر تھے +

ضبط کروں میں کب تک اب ... چل رے خامہ! بسم اللہ اب
کر ٹک+ دل کا رازِ نہانی ... ثبت جریدہ میری زبانی
یعنی - میر اِک خستۂ غم تھا ... سرتاپا اندوہ و الم تھا
تاب و توان و شکیب و تحمل ... رخصت اُس سے ہو گئے بالکل
سینہ فگاری سامنے آئی ... بیتابی نے طاقت پائی
خواب و خورش کا نام نہ آیا ... ایک گھڑی آرام نہ پایا
سوز سے چھاتی تابہ گویا ... اور پلک خونابہ گویا
دل میں تمنّا - داغ جگر میں ... شیون لب پر - یاس نظر میں
نالے شب کو اُس کے شتکر ... درگئے کتنے - سر کو دُھن کر
روئے و جبیں پہ خراشِ ناخن ... داغوں سے دل کے قامت گلبن
غم نے تو دل میں کیا ہی چھوڑا ... ہر دم تھا اک بکّا پھوڑا
کام رہا ناکامی ہی سے ... تسکیں بے آرامی ہی سے
دشنۂ غم سے سینہ کوچا ... ناخن سے منہ سارا نوچا

+ ٹک اب متروک ہے ۱۲

دل آماجگہِ غمناکی
نے طاقت نے یارا اُس کو
رنگ اُڑے چہرہ کا ہر دم
رنگ شکستہ۔ بسکہ فسردہ
دیدۂ تر کے دریا قائل
ہر دم ہو ہر سمت کو جاری
خاک بسر آشفتہ سری سے
وادی پر جب اپنے آوے
سر پر اُس کے سنگ ہمیشہ
آہِ سرد کرے وہ عُریاں
پامالی میں مثلِ جادہ
اُس کے جو پامال ہوئے سب
جس نے دیکھا اُس کو یکدم

اور نفس اِک تیرِ خاکی
ضُعفِ دلی نے مارا اُس کو
تھا گویا گلِ آخرِ موسم
کہنے کو زندہ۔ لیکن مُردہ
ساحل خشک لبی کے سائل
خونباری سے سیلِ بہاری
شورِ قیامت نوحہ گری سے
صحرا صحرا خاک اُڑاوے
جی پر عرصہ تنگ۔ ہمیشہ
بید سا کانپے موئے پریشاں
نقشِ قدم سا خاک اُفتادہ
خارِ بیاباں لال ہوئے سب
اُس نے کہا یہ۔ بھول کے سب غم

چندے یہ ناشاد رہے گا
پہ مدت تک یاد رہے گا

(میر)

غزلیات

جہاں اُستاد۔ فصیح الملک۔ نواب میرزا خان۔ داغ دہلوی

(۱)

جہاں تیرے جلوہ سے معمور نکلا — پڑی آنکھ جس کوہ پر طور نکلا
یہ سمجھے تھے ہم ایک چرکا ہے دل پر — دبا کر جو دیکھا۔ تو ناسور نکلا
نہ نکلا کوئی بات کا اپنی پورا — مگر ایک نکلا۔ تو منصور نکلا
وجود و عدم دونوں گھر پاس نکلے — نہ یہ دور نکلا۔ نہ وہ دور نکلا
سمجھتے تھے ہم داغ گمنام ہوگا — مگر وہ تو عالم میں مشہور نکلا

(۲)

وہ زمانہ نظر نہیں آتا — کچھ ٹھکانا نظر نہیں آتا
دل نے اُس بزم میں بٹھا تو دیا — اُٹھ کے جانا نظر نہیں آتا
رہئے مشتاقِ جلوۂ دیدار — ہم نے مانا۔ نظر نہیں آتا
لے چلو مجکو رہروانِ عدم — یہاں ٹھکانا نظر نہیں آتا
دلِ پُر آرزو لٹا اے داغ — وہ خزانہ نظر نہیں آتا

(۳)

دل میں ہے غم و رنج و الم۔ حرص و ہوا بند — دنیا میں مُخَمَّس کا ہمارے نہ کھلا بند
موقوف نہیں دام و قفس پر ہی اسیری — ہر غم میں گرفتار ہوں۔ ہر فکر میں پابند

اے حضرتِ دل! جائیے - میرا بھی خدا ہے / بے آپ کے رہنے کا نہیں کام مرا بند
دم رُکتے ہی سینہ سے نکل پڑتے ہیں آنسو / بارش کی علامت ہے - جو ہوتی ہے ہوا بند
کہتے تھے ہم - اے داغ! وہ کوچہ ہے خطرناک / چھپ چھپ کے مگر آپ کا جانا نہ ہوا بند

(۴)

حضرتِ دل! آپ ہیں جس دھیان میں / مرگئے لاکھوں اسی ارمان میں
گر فرشتہ وش ہوا کوئی - تو کیا؟ / آدمیت چاہیئے انسان میں
جس نے دل کھویا - اُسی کو کچھ ملا / فائدہ دیکھا - اسی نقصان میں
کس نے ملنے کا کیا وعدہ - کہ داغ / آج ہو تم اَور ہی سامان میں

(۵)

خدا دے - تو دے اپنا غم ہر کسی کو / کرے پر نہ مائل کسی پر کسی کو
نہ کر ناصحا! ایسی دیوانی باتیں / یہ کیا؟ کھینچ مارا جو پتھر کسی کو
محبت میں جس جا گئے - لٹ گئے ہم / لیا دل کسی نے - دیا سر کسی کو
بہت چھیڑ کر ہم کو پچھتایئے گا / ستاتے نہیں بندہ پرور! کسی کو

(۶)

نہیں ہوتی بندہ سے طاعت زیادہ / بس اب خانہ آباد! دولت زیادہ!
وہ تشریف لاتے ہی بولے - کہ رخصت! / نہیں ہم کو ملنے کی فرصت زیادہ!
الٰہی! زمانہ کو کیا ہو گیا ہے؟ / محبت تو کم ہے - عداوت زیادہ!
عدم سے سب آتے ہیں یاں چار دن کو / نہیں ہوتی منظور رخصت زیادہ
مری بندگی سے مرے جرم افزوں / ترے قہر سے تیری رحمت زیادہ

(۷)

دل کی کلی نہ تجھ سے کبھی اے صبا کھِلی
چمپا کھِلی - گلاب کھِلا - موتیا کھِلی

ہم تو اسیرِ دام ہیں صیّاد! ہم کو کیا؟
گلشن میں گر بہار بہت خوش نما کھِلی

نالوں سے شق ہوا نہ جگر پاسبان کا
دیوارِ قید خانہ مگر بارہا کھِلی

رونا نصیب میں ہو - تو ہنسنا ہو کس طرح؟
تو شکلِ گُل نہ بُلبلِ خونیں نوا کھِلی

داغِ شگفتہ دِل کا ذرا دیکھنا اثر
مانندِ غنچہ قبر بھی بعدِ فنا کھِلی

(۸)

سب حسرتوں کا یاس نے کھٹکا مٹا دیا
جن سے خلش تھی دل میں - وہ کانٹے نکل گئے

سچ ہے - پرائی آگ میں پڑتا نہیں کوئی
ہمراہ کوہِ طور کے موسیٰ نہ جل گئے؟

اب کیا ہے! اگر کسی سے ملاتے نہیں نظر
لاکھوں ہماری آنکھ سے جلسے نکل گئے

مرتے کے ساتھ کوئی بھی مرتا نہیں کبھی
فرقت میں رفتہ رفتہ سب احباب ٹل گئے

احباب ڈھونڈتے ہیں - پریشان ہیں رفیق
کیا جانئے! آج داغ کدھر کو نکل گئے

(۹)

غم اُٹھانے کے واسطے دم ہے
زندگی ہے اگر - تو کیا غم ہے!

کہتے ہو - کچھ کہو - کہوں کیا خاک!
جانتا ہوں - مزاج برہم ہے

اب جہاں مہرباں ہوا - تو کیا!
مہربانی تری مقدّم ہے

سُنتے ہیں - داغ! کل وہ آئے تھے
بارے اب تو سلوک باہم ہے

(۱۰)

طبیعت کوئی دن میں بھر جائیگی
چڑھی ہے یہ آندھی اُتر جائیگی

رہیں گی دمِ مرگ تک خواہشیں — یہ نیت کوئی آج بھر جائیگی
نہ تھی یہ خبر ہم کو۔ اپنی بہار — اِدھر آئیگی اور اُدھر جائیگی
نہ چھوڑیگی دامن کبھی مشتِ خاک — صبا ہم سے اُڑکر کدھر جائیگی
دیا دل۔ تو اے داغ! اندیشہ کیا؟ — گزرنی جو ہوگی۔ گزر جائیگی

امیر الشعرا منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی

(۱)

ریاضِ دہر میں پوچھو نہ میری بربادی — برنگِ بو اِدھر آیا اُدھر روانہ ہوا
خدا کی راہ میں دینا ہے گھر کا بھر لینا — اِدھر دیا۔ کہ اُدھر داخلِ خزانہ ہوا
قدم حضور کے آئے۔ مرے نصیب کھُلے — جوابِ قصرِ سلیماں غریب خانہ ہوا
جب آئی جوش پہ میرے کریم کی رحمت — گرا جو آنکھ سے آنسو۔ دُرِ یگانہ ہوا
چُنے مہینوں ہی تنکے غریب بلبل نے — مگر نصیب نہ دو روز آشیانہ ہوا
اُٹھائے صدمے پہ صدمے۔ تو آبرو پائی — امیرؔ ٹوٹ کے دل گوہرِ یگانہ ہوا

(۲)

وہ تو سُنتا ہی نہیں۔ میں دادخواہی کیا کروں؟ — کس کے آگے جا کے سر پھوڑوں الٰہی کیا کروں؟
مجھ گدا کو دے نہ تکلیفِ حکومت۔ اے ہوس! — چار دن کی زندگی میں بادشاہی کیا کروں؟
مجھ کو ساحل تک خدا پہنچائیگا۔ اے ناخدا! — اپنی کشتی کی بیاں تجھ سے تباہی کیا کروں؟

وہ مرے اعمالِ روز و شب سے واقف ہیں امیرؔ!
پیشِ خالق ادّعائے بے گناہی کیا کروں؟

(۳)

انساں عزیزِ خاطرِ اہلِ جہاں نہ ہو
وہ مہرباں نہ ہو۔ تو کوئی مہرباں نہ ہو

پیری میں بھی گیا نہ تغافل ہزار حیف
اتنا بھی کوئی مائلِ خوابِ گراں نہ ہو

آنکھوں سے فائدہ؟ جو نہ دیدار ہو نصیب
حاصل جبیں سے کیا؟ جو ترا آستاں نہ ہو

جانے اگر۔ کہ چاہِ عدم میں گرائیگا
کوئی سوارِ توسنِ عمرِ رواں نہ ہو

(۴)

دل نے جب پوچھا۔ مجھے کیا چاہیئے؟
درد بول اُٹھا۔ تڑپنا چاہیئے

حرصِ دنیا کا بہت قصہ ہے طول
آدمی کو صبر تھوڑا چاہیئے

ترکِ لذّت بھی نہیں لذّت سے کم
کچھ مزہ اِس کا بھی چکھا چاہیئے

ہے مزاج اُس کا بہت نازک امیر!
ضبطِ اظہارِ تمنّا چاہیئے

(۵)

کی دل شکنی نہ تند خو کی
سختی پہ بھی نرم گفتگو کی

کی جس پہ نگاہ۔ تجھ کو دیکھا
اب تک تو نظر کہیں نہ چوکی

جز دیر و حرم کہاں میں جاؤں
راہیں تو یہی ہیں جستجو کی

دل ہی نہ رہا اُمید کیسی
جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی

کُلفت نہ مٹی امیر! دل سے
اشکوں نے ہزار شست و شو کی

(۶)

موتی کی طرح جو ہو خدا داد
تھوڑی سی بھی آبرو بہت ہے

جاتے ہیں جو صبر و ہوش۔ جائیں
مجھ کو اے درد! تو بہت ہے

مانندِ کلیم بڑھ نہ اے دل!
یہ دور کی گفتگو بہت ہے

اے نشترِ غم! ہو لاکھ تن خشک
تیرے دم کو لہو بہت ہے

کیا غم ہے **امیر**! اگر نہیں مال
اِس وقت میں آبرو بہت ہے

از مؤلّف

(۱)

کام اگر حسبِ مدعا نہ ہوا
تیرا چاہا ہوا۔ بُرا نہ ہوا

سب جتایا کیۓ نیازِ قدیم
وہ کسی کا بھی آشنا نہ ہوا

کیا کھُلے ہو جو کبھی نہ تھا پنہاں
کیوں ملے ہو جو کبھی جُدا نہ ہوا

سخت فتنہ جہان میں اُٹھتا
کوئی تجھ سا ترے سوا نہ ہوا

تو نہ ہو۔ یہ تو ہو نہیں سکتا
اَور کوئی ہوا۔ ہوا۔ نہ ہوا

(۲)

جو بھلے بُرے کی اٹکل نہ مرا شعار ہوتا
نہ جزاے خیر پاتا۔ نہ گناہگار ہوتا

میں کبھی کا مر بھی رہتا۔ نہ غمِ فراق سہتا
اگر اپنی زندگی پر۔ مجھے اختیار ہوتا

کبھی بھولکر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو تم سے کوئی کرتا۔ تمھیں ناگوار ہوتا

ہے اِس انجمن میں یکساں عدم و وجود میرا
کہ جو میں یہاں نہ ہوتا۔ یہی کاروبار ہوتا

(۳)

کبھی تقصیر جس نے کی ہی نہیں
ہم سے پوچھو تو آدمی ہی نہیں

دوستی اور کسی غرض کے لئے!
وہ تجارت ہے۔ دوستی ہی نہیں

جامِ وحدت کی دُرد بھی جس نے — نہیں چکھی - وہ متّقی ہی نہیں
جس خوشی کو نہ ہو قیام و دوام — غم سے بدتر ہے - وہ خوشی ہی نہیں

(۴)

جہاں تیغِ ہمّت علَم دیکھتے ہیں — محالات کا سر قلم دیکھتے ہیں
کمالاتِ صانع پہ جن کی نظر ہے — وہ خوبیٔ مصنوع کم دیکھتے ہیں
نہیں مبتلا جو تن آسانیوں میں — اُنہیں دمبدم تازہ دم دیکھتے ہیں
اُڑاتے ہیں جو رخشِ ہمّت کو سرپٹ — وہ منزل کو زیرِ قدم دیکھتے ہیں

(۵)

ہے وصف ترا محیطِ اعظم — یہاں تاب کسے شناوری کی
دی زندگی اور اُس کا ساماں — کیا شان ہے بندہ پروری کی
کیا آنکھ کو تِل دیا! کہ جس میں — وُسعت ہے چرخ چنبری کی
کی بعدِ خزاں بہار پیدا — سوکھی ٹہنی ہری بھری کی
کیا بات ہے! گر کیا ترحم — ہیہات! جو تو نے داوری کی
ہر شکل میں تھا وہی نمودار — ہم نے ہی نگاہ سرسری کی

(۶)

راہ و رسمِ خط کتابت ہی سہی — گُل نہیں - تو گُل کی نکہت ہی سہی
بیدماغی بندہ پرور! اس قدر! — آپ کی سب پر حکومت ہی سہی
بسکہ ذکر العیش نصف العیش ہے — یادِ ایّامِ فراغت ہی سہی
حُسنِ صورت کا نہ کھا اصلا فریب! — کِلکِ صنعت گر کی صنعت ہی سہی

کچھ نہ کرنا بھی مگر اک کام ہے	گر نہیں صحبت۔ تو عزلت ہی سہی

(۷)

ممکن ہے۔ کہ ٹل جائے جبل اپنے مقر سے	لیکن کبھی تبدیل جبلت نہیں ہوتی
ہو جان کی جوکھوں بھی اگر راہِ طلب میں	پست اس سے اُولو العزم کی ہمت نہیں ہوتی
خلوت میں بھی لاتے نہیں عاقل اُسے مُنہ پر	جو بات کہ شائستۂ جلوت نہیں ہوتی
ہم کرتے ہیں عادت کی غلامانہ اطاعت	اصلاح پذیر اس لئے عادت نہیں ہوتی
پتّے کی طرح جو کوئی محکوم ہوا ہو	اُس شخص کی دنیا میں کبھی پت نہیں ہوتی
ڈھاتی ہے قیامت یہی خونخوار جہاں میں	کچھ غم نہیں ہوتا۔ جو محبت نہیں ہوتی

(۸)

لو جان بیچکر بھی۔ جو فضل و ہنر ملے	جس سے ملے۔ جہاں سے ملے۔ جس قدر ملے
جب چشمِ آز پھوٹ گئی سب خلش مٹی	اب سنگریزہ ہاتھ لگے۔ یا گہر ملے
ممکن نہیں بغیرِ قناعت فراغِ بال	ہر چند تودہ تودہ تجھے سیم و زر ملے
جن کو نہیں ہے درد و دوا میں کچھ امتیاز	قسمت سے ان گنوں کے ہمیں چارہ گر ملے

(۹)

غیرِ توکل نہیں چارا مجھے	اپنے ہی دم کا ہے سہارا مجھے
حرص و طمع نے تو ڈبویا ہی تھا	صبر و قناعت نے اُبھارا مجھے
جو وہ کرے اُس کو سزاوار ہے	چون و چرا کا نہیں یارا مجھے
فرصتِ اوقات ہے بس مُغتنم	یہ نہیں ملنے کی دوبارا مجھے
آہ! نہیں رخصتِ افشائے راز	قصّہ تو معلوم ہے سارا مجھے

سراج الدین محمدؐ۔بہادر شاہ۔ظفر

سراج الدین محمدؐ نام بہادر شاہ لقب۔ظفر تخلص۔آخری جانشین شاہانِ مغلیہ۔شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔اِن کا کلام نہایت سادہ سلیس اور روز مرہ اُردو کا عمدہ نمونہ ہے +

(۱)

کسی نے اُس کو سمجھایا تو ہوتا
کوئی یہاں تک اُسے لایا تو ہوتا

نہ بھیجا تو نے لکھ کر ایک پرچہ
ہمارے دل کو پرچایا تو ہوتا

نہ بولا۔ہم نے کھڑکایا بہت در
ذرا درباں کو کھڑکایا تو ہوتا

جو کچھ ہوتا سو ہوتا۔تو نے تقدیر!
وہاں تک مجکو پہنچایا تو ہوتا

دل اُس کی زلف میں اُلجھا ہے کب سے
ظفر! اِک روز سلجھایا تو ہوتا

(۲)

ہر بات میں تو ایک بھی ہے لاکھ پہ بھاری
گر بات کو اپنی نہ کرے طول سے ہلکا

ہے جامہ تکلف کا پسندیدۂ احمق
ہوگا نہ گدھا یہ کبھی اِس جھول سے ہلکا

جُز تارکِ دنیا ہو ہوس سے نہ سبکدوش
یہ بوجھ نہ دنیا کے ہو مشغول سے ہلکا

صرفہ نہیں کاغذ کا۔مگر بھیجتے ہیں وہ
خط ڈاک میں اندیشۂ محصول سے ہلکا

دنیا میں ظفر جو ہے گرانبارِ جہالت
کب ہوتا ہے وہ مردمِ معقول سے ہلکا

(۳)

آکے پروانہ ہی کیا اس بزم میں جل بُھن گیا؟
شمع بھی یہاں رو گئی شعلہ بھی یہاں سر دُھن گیا

جائیے اُس در پہ اور دھونی رما کر بیٹھئے
جو گیا دل سوختہ وہاں باندھ کر یہ دُھن گیا

نام جس کا رہگیا۔کچھ اُس کا گُن باقی رہا
ورنہ جو یہاں سے گیا ساتھ اُس کے اُس کا گُن گیا

میں صبا! وہ طائرِ بے طاقت اس گلشن میں ہوں
ایک پر جس کا نہ اُڑ کر تا سرِ گلبن گیا

واسطے بے مغز کے کیا خاک ہو نشو و نما!
سبز ہو سکتا نہیں وہ۔ جو کہ دانہ گھن گیا

جاگ اُٹھا خوابِ عدم سے یک بیک سارا جہاں
کان میں جس دم ظفر! خالق کا امرِ کُن گیا

(۴)

غم خانۂ دنیا میں ہے جینے کا مزا ہیچ!
اس بے مزگی میں کوئی جیتا ہے تو کیا ہیچ!

کیا کیا محل و قصر بناتے ہیں تونگر
از بہرِ نشاں۔ لیک نشاں بعدِ فنا ہیچ!

ایماں کو نہ دے ہاتھ سے غافل! کہ پسِ مرگ
آئیگا نہیں کام ترے اس کے سوا ہیچ!

(۵)

چاہتے ہیں کب نشاں اپنا مثالِ نقشِ پا!
جو کہ مٹانے کو بیٹھے ہیں فنا کی راہ پر

دل سے ہو کیونکر طریقِ آشنائی میں خلاف
آشنا وہ ہے۔ کہ جو ہو آشنا کی راہ پر

ہے صراط المستقیم اُس کے لئے جس نے ظفر!
استقامت کی ہے تسلیم و رضا کی راہ پر

(۶)

اتنا نہ اپنے جامہ سے باہر نکل کے چل
دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ۔ سنبھل کے چل

کم ظرف پُر غرور! ذرا اپنا ظرف دیکھ
مانندِ جوشِ خم نہ زیادہ اُبل کے چل

فرصت ہے اک صدا کی یہاں سوزِ دل کے ساتھ
اس پر سپند وار نہ اتنا اُچھل کے چل

یہ غول وش ہیں۔ ان کو سمجھ تو نہ رہنما
سایہ سے بچکے اہلِ فریب و دغل کے چل

ق

انسان کل کا پتلا بنایا ہے اُس نے آپ
اور آپ ہی وہ کہتا ہے پتلے کو کل کے "چل"

پھر آنکھیں بھی تو دی ہیں۔ کہ رکھ دیکھکر قدم
کہتا ہے کون تجکو! نہ چل۔ چل سنبھل کے چل!

جو امتحانِ طبع کرے اپنا۔ اے ظفر!
تو کہدو اُس کو۔ طور یہ تو اس غزل کے چل

(۷)

نہیں تم کو لازم بُرائی کی باتیں
بھلوں کو ہیں زیبا بھلائی کی باتیں

غضب ہے! کہ دل میں تو رکھو کدورت
کرو مُنہ پہ ہم سے صفائی کی باتیں

اگر سیدھے ہوتے مرے بختِ واژوں
تو کیوں کرتے وہ کج ادائی کی باتیں

قفس میں ہے کیا فائدہ شور و غل سے
اسیرو! کرو کچھ رہائی کی باتیں

ظفر! کیا زمانہ بُرا آگیا ہے
جہاں دیکھو ہیں واں بُرائی کی باتیں

(۸)

گرد جو اے شہسوار! آئی نظر اُڑتی ہوئی
تیرے آنے کی ہمیں پُہنچی خبر اُڑتی ہوئی

دل جلوں کی ہوتی قسمت میں نہ بربادی۔ تو کیوں
پھرتی پروانہ کی خاکستر سحر اُڑتی ہوئی

وہ شکار انداز لے جب ہاتھ میں اپنے تفنگ
برق تھرّا جائے رنجک دیکھکر اُڑتی ہوئی

بے ثباتی کیا کہوں ہستی کی؟ دیکھی ہی نہیں
سُرخیِ رنگِ حنا جلد اس قدر اُڑتی ہوئی

ہے تو کچھ رونق صفائی میں ہی دل کی۔ ورنہ یاں
خاک ہی دیکھی کدورت میں ظفر! اُڑتی ہوئی

(۹)

کیا کیا آکر تری محفل میں ہم نے شمع ساں!
ہاں! مگر جلکر بُروں کی جان کو ہم رو گئے

حضرتِ دل تو گئے۔ پر کر گئے اور اک ستم
ساتھ اپنے مجکو بھی دونوں جہاں سے کھو گئے

شوق اپنا تم سے دونا ہی محبت میں رہا
جب وہاں سے ایک خط آیا۔ یہاں سے دو گئے

اے ظفر! جاؤ۔ دلِ دیوانہ کو ڈھونڈو کہیں
ہے خدا جانے کہاں؟ مدت ہوئی اُس کو گئے

ملک الشعرا شیخ ابراہیم ذوق

کلام نہایت عام پسند۔ محاورات و ضرب الامثال خوب باندھتے ہیں۔ مفصّل حال دیکھو صفحہ ۲ حصۂ نثر

(۱)

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا
اگر پایا۔ تو کھوج اپنا نہ پایا

جس انساں کو سگِ دُنیا نہ پایا
فرشتہ اُس کا ہم پایا نہ پایا

مقدّر ہی پہ گر سود و زیاں ہے
تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا۔ نہ پایا

سُراغِ عمرِ رفتہ ہو۔ تو کیونکر ہ
کہیں جس کا نشانِ پا نہ پایا

رہِ گُم گشتگی میں ہم نے اپنا
غُبارِ راہ بھی عَنقا نہ پایا

رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم
کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا

اِحاطے سے فلک کے۔ ہم تو کب کے
نکل جاتے۔ مگر رستا نہ پایا

یہاں دیکھا۔ کسی کے ساتھ دیکھا
کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

کہے کیا ہائے زخمِ دل ہمارا !
دہن پایا۔ لبِ گویا نہ پایا

کبھی تو اور کبھی تیرا رہا غم
غرض۔ خالی دلِ شیدا نہ پایا

نظیر اُس کا کہاں عالم میں! اے ذوق
کہیں ایسا نہ پائے گا۔ نہ پایا

(۲)

نالہ اِس زور سے کیوں میرا دُہائی دیتا
اے فلک! گر تجھے اونچا نہ سُنائی دیتا

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تِل میں ہے دکھائی دیتا

کون گھر آئینہ کے جاتا ؟ اگر وہ گھر میں
خاکساری سے نہ جاروب صفائی دیتا

مُنہ سے بس کرتے نہ ہر گز یہ خدا کے بندے
گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا

دیکھ۔ اگر دیکھنا ہے ذوقؔ! کہ وہ پردہ نشیں
دیدۂ روزنِ دل سے ہے دکھائی دیتا

(۳)

بے نصیب اُس کے ہیں گر دیدار سے
سی دو آنکھوں کو نظر کے تار سے

اُٹھ چُکا وہ ناتواں۔ جو رہ گیا
دبکے تیرے سایۂ دیوار سے

اپنے دامن کو بچاکر جائیو
برق! میرے وادیِ پُرخار سے

ناکسوں سے کیا رُکیں وارستگاں!
اُلجھے کب دامن صبا کا خار سے

(۴)

وہ خُلق سے پیش آتے ہیں۔ جو فیض رساں ہیں
ہے شاخِ ثمردار میں گُل پہلے ثمر سے

فریادِ ستم کش ہے وہ شمشیر کشیدہ
جس کا نہ رُکے وار فلک کی بھی سپر سے

اشکوں میں بہے جاتے ہیں ہم سوے درِ یار
مقصود رہِ کعبہ ہے دریا کے سفر سے

اے ذوقؔ! کسی ہمدمِ دیرینہ کا مِلنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

(۵)

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
اُن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

رہے جوں شیشۂ ساعت وہ مُکدّر دونوں
کبھی مِل بھی گئے دو دل جو کدورت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پانوں بقدرِ وُسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

نہیں جُز شمع مجاور مرے بالینِ مزار
نہیں جُز کثرتِ پروانہ زیارت والے

نہ ستم کا کبھی شکوہ۔ نہ کرم کی خواہش
دیکھ تو! ہم بھی ہیں۔ کیا صبر و قناعت والے!

کیا تماشا ہے! کہ مثلِ مہِ نو اپنا فروغ
جانتے اپنی حقارت کو ہیں شہرت والے

کبھی افسوس ہے آتا۔ کبھی رونا آتا
دلِ بیمار کے ہیں دو ہی عیادت والے

ناز ہے گُل کو نزاکت پہ چمن میں۔ اے ذوق اُس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

(۶)

نہیں ثبات بلندیِ عزّوشاں کے لئے کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے
نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی۔ کہ یہ شئے عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے
جو پاسِ مہر و محبّت کہیں یہاں بکتا تو مول لیتے ہم اِک اپنے مہرباں کے لئے
اگر اُمید نہ ہمسایہ ہو۔ تو خانۂ یاس بہشت ہے ہمیں آرامِ جاوداں کے لئے
وبالِ دوش ہے اِس ناتواں کو سر۔ لیکن لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے
بنایا آدمی کو ذوق! ایک جُزوِ ضعیف اور اس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کے لئے

(۷)

ایسا نہ ہو کہ آتے ہی آتے جوابِ خط قاصد! جواب زندگیٔ مُستعار دے
اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات ہنسکر گُزار یا اِسے روکر گزار دے
بے فیض گر ہے چشمۂ آبِ بقا۔ تو کیا! مانگو۔ تو ایک قطرہ نہ آئینہ دار دے
پشہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی جب قصدِ خوں کو آئے۔ تو پہلے پکار دے
اِس جبر پر تو ذوق! یہ انساں کا حال ہے کیا جانے کیا کرے! جو خدا اختیار دے

(۸)

لائی حیات۔ آئے۔ قضا لے چلی۔ چلے اپنی خوشی نہ آئے۔ نہ اپنی خوشی چلے
ہمسا بھی۔ اِس بساط پہ کم ہو گا بدقمار جو چال ہم چلے۔ وہ نہایت بُری چلے
بہتر تو ہے یہی۔ کہ نہ دنیا سے دل لگے پر کیا کریں! جو کام نہ بے دل لگی چلے
ہو عمرِ خضر بھی۔ تو ہو معلوم وقتِ مرگ ہم کیا رہے یہاں! ابھی آئے۔ ابھی چلے

حکیم مومن خان۔ مومن

مومن خان نام۔ مومن تخلّص۔ وطن دلّی۔ طبابت پیشہ آبائی۔ ۱۲۱۵ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۶۸ھ میں رحلت کی۔ نہایت ذکی و ذہین آدمی تھے۔ اُن کی روش خاص مُعاملہ بندی ہے۔ کہیں میر و درد کی سی سادہ بیانی۔ کہیں باریکی۔ ذوق و غالب کے ہمعصر تھے +

(۱)

وعدۂ وصلت سے ہو دل شاد کیا!
تم سے دشمن کی "مبارکباد" کیا!

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا ؟

ہیں اسیر اُس کے۔ جو ہے اپنا اسیر
ہم نہ سمجھے صید کیا! صیّاد کیا!

نالہ اِک دم میں اُڑا ڈالے دھوئیں
چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا!

جب مجھے رنجِ دل آزاری نہ ہو
بے وفا! پھر حاصلِ بیداد کیا ؟

کیا کروں اللہ! سب ہیں بے اثر
ولولہ کیا! نالہ کیا! فریاد کیا!

اِن نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا!

بُتکدہ جنّت ہے۔ چلیئے بے ہراس
لب پہ "مومن" ہرچہ بادا باد" کیا ؟

(۲)

کیا رام نہ کروگے۔ اگر ابرام نہ ہوگا
الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا

ہاں جوشِ تپش! چھیڑ چلی جائے۔ کہ پرتو
جھڑ جائینگے۔ فرسودہ اگر دام نہ ہوگا

ناکامیِ اُمید پہ صبر آئے۔ تو کیا آئے
ہر بات میں کہتے ہو۔ کہ یہ کام نہ ہوگا

وہ مشق رہی اور نہ وہ شوق ہے مومن!
کیا شعر کہیں گے۔ اگر الہام نہ ہوگا

(۳)

اثر اُس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

اُس نے کیا جانے! کیا کیا لیکر!
دل کسی کام کا نہیں ہوتا

آہ! طولِ امل ہے روز افزوں
گرچہ اِک مدعا نہیں ہوتا

نارسائی سے دم رُکے۔ تو رُکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمھارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سُنے عرض **مومنِ** مضطر
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

(۴)

قابو میں نہیں ہے دلِ کم حوصلہ اپنا
اس جور پہ جب کرتے ہیں تجھ سے گلہ اپنا

لبیکِ حرم ہم ہیں۔ نہ ناقوسِ کلیسا
پھر شیخ و برہمن میں ہے کیوں غُلغلہ اپنا؟

تھے دشت میں ہمراہ مرے آبلۂ چند
سو آپ ہی پامال کیا قافلہ اپنا

اِس حال کو پُہنچے ترے قصّے سے۔ کہ اب ہم
راضی ہیں۔ گر اعدا بھی کریں فیصلہ اپنا

انصاف کے خواہاں ہیں۔ نہیں طالبِ زر ہم
تحسینِ سخن فہم ہے **مومن** صلہ اپنا

(۵)

تم بھی رہنے لگے خفا۔ صاحب!
کہیں سایہ مرا پڑا۔ صاحب!

ستم۔ آزار۔ ظلم۔ جور۔ جفا
جو کیا۔ سو بھلا کیا۔ صاحب!

کیوں اُلجھتے ہو جنبشِ لب سے
خیر ہے! میں نے کیا کہا؟ صاحب!

کیوں لگے دینے خطِّ آزادی
کچھ گُنہ بھی غلام کا؟ صاحب!

نام عشقِ بتاں نہ لو-مومن! — کیجئے بس خدا خدا- صاحب!

(۶)

ٹھانی تھی دل میں-اب نہ ملینگے کسی سے ہم — پر کیا کریں! کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
مجھ سے نہ بولو تم-اسے کیا کہتے ہیں بھلا! — انصاف کیجئے-پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم
صاحب نے کس غلام کو آزاد کر دیا؟ — لو بندگی! کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم
کب گُل کھلیگا! دیکھئے! ہے فصلِ گُل تو دور — اور سوے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم
لے نام آرزو کا- تو دل کو نکال لیں — مومن نہ ہوں-جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

(۷)

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اُٹھے — کیا عَلَم دھوم سے تیرے شہدا کے اُٹھے
گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے اِک حرفِ غلط — لیک اُٹھے بھی-تو اک نقش بٹھا کے اُٹھے
اُف رے گرمیٔ محبت! کہ ترے سوختہ جاں — جس جگہ بیٹھ گئے-آگ لگا کے اُٹھے
میں دکھاتا تمھیں تاثیر-مگر ہاتھ مرے — ضعف کے ہاتھ سے کب وقت دُعا کے اُٹھے
شعر مومن کے پڑھے بیٹھ کے اُس کے آگے — خوب احوالِ دلِ زار سُنا کے اُٹھے

(۸)

اگر غفلت سے باز آیا-جفا کی — تلافی کی بھی ظالم نے-تو کیا کی
فلک کے ہاتھ سے میں جا چھپوں-گر — خبر لا دے کوئی تحت الثّرےٰ کی
جفا سے تھک گئے-تو بھی نہ پوچھا — کہ تو نے کس توقع پر وفا کی؟

کہا اُس شوخ سے "مرتا ہے مومن"
کہا "میں کیا کروں! مرضی خُدا کی"

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ

مصطفیٰ خان نام۔ شیفتہ تخلص۔ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے جاگیر دار۔ اور عمائد دہلی سے تھے۔ اِن کی ذاتِ ستودہ صفات امارت۔ فقر اور علم و فضل کی جامع تھی۔ ریختہ میں حکیم مومن خان مومن سے مشورہ کرتے تھے۔ کلام نہایت متین و سنجیدہ۔ فارسیت کا رنگ غالب ۔ ۱۲۷۷ہجری میں رحلت فرمائی +

(۱)

اے جانِ بیقرار ذرا صبر چاہئے
بے شک اِدھر بھی آئیگا جھونکا نسیم کا

جس کی سرشت صاف نہ ہو آدمی نہیں
نیرنگ و عشوہ کام ہے دیوِ رجیم کا

طاعت اگر نہیں۔ تو نہ ہو۔ یاس کس لئے!
وابستۂ سبب ہے کرم کب کریم کا

جس وقت تیرے لطف کے دریا کو جوش آئے
فوّارۂ جناں ہو زبانہ جحیم کا

اے شیفتہ! عذابِ جہنّم سے کیا مجھے؟
میں اُمتی ہوں نار و جناں کے قسیم کا

(۲)

دلِ زار کا ماجرا کیا کہوں!
فسانہ ہے مشہور سیماب کا

کہاں پھر وہ نایاب! پایا جسے
غلط شوق ہے جنسِ نایاب کا

نہ کیجو غل۔ اے خوشنوایانِ صبح!
یہ ہے وقت اُن کے شکر خواب کا

محبّت نہ ہرگز جتائی گئی
رہا ذکر کل اَور ہر باب کا

وہاں تیرہ روزوں کی پروا کسے
جہاں شغل ہو سَیرِ مہتاب کا

میں بیجرم رہتا ہوں خائف۔ کہ واں
جفا میں نہیں دخل اسباب کا

نہ کرنا خطا پر نظر شیفتہ!
کہ اغماض شیوہ ہے اَحباب کا

(۳)

اہلِ طریق کی بھی روش سب سے ہے الگ — جتنا زیادہ شغل۔ زیادہ فراغ بال

ہنگامِ عہد کام میں لائے وہ ایسے لفظ — جن کو معانیِ متعدّد پر اشتمال

یہ بات تو غلط ہے۔ کہ دیوانِ شیفتہ — ہے نسخۂ معارف و مجموعۂ کمال

لیکن مبالغہ تو ہے البتہ! اس میں کم — ہاں! ذکرِ خدو خال۔ اگر ہے۔ تو خال خال

(۴)

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں؟ — گُل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

سب اُس میں محو اور وہ سب سے علیحدہ — آئینہ میں ہے آب۔ نہ آئینہ آب میں

معنی کی فکر چاہیے صورت سے کیا حصول! — کیا فائدہ ہے موج اگر ہے سراب میں

ذات و صفات میں بھی یہی ربط سمجھئے — جو آفتاب و روشنیِ آفتاب میں

قطعِ نظر جو نقش و نگارِ جہاں سے ہو — دیکھو وہ آنکھ سے۔ جو نہ دیکھا ہو خواب میں

مرنے کے بعد بھی کہیں شاید پتا لگے — کھویا ہے ہم نے آپ کو عہدِ شباب میں

وہ قطرہ ہوں۔ کہ موجۂ دریا میں گُم ہوا — وہ سایہ ہوں۔ کہ محو ہوا آفتاب میں

اُس صوتِ جاں نواز کا ثانی نہیں بنا — کیا ڈھونڈھتے ہو! بربط و عود و رباب میں

اے آفتِ زمانہ! تیرے دَور میں شکیب — بلبل کو باغ میں ہے۔ نہ ماہی کو آب میں

بیباک شیوہ۔ شوخ طبیعت۔ زبان دراز — مُلزم ہوا ہے۔ پر نہیں عاجز جواب میں

تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو۔ مگر حضور! — اِس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

(۵)

جو کہ ہوا محوِ تجلّیِ ذات — خاکِ در اُس شخص کی اکسیر ہے

کھیں ہے کچھ یہ؟ کہ دکھادوں تمھیں
فرض کیا۔ آہ میں تاثیر ہے

خط کے نہ لکھنے کا لکھوں کیا گلہ؟
خامہ! مدد کر۔ دمِ تحریر ہے

کیا کہوں! احباب کی آہن دلی
پانوں میں فولاد کی زنجیر ہے

ہم سے وہ ناحق جو خفا ہوگئے
شیفتہ! کچھ اپنی ہی تقصیر ہے

(۶)

ستمگر کہے سے بُرا مانتا کیوں!
ستم کو اگر وہ بھلا جانتا ہے

جو بیگانہ جانے تجھے خلق۔ کیا غم!
اگر آشنا۔ آشنا جانتا ہے

اُسے کُنجِ خلوت کی کیا ہے ضرورت!
جو محفل کو خلوت سرا جانتا ہے

بہرصورت آئینہ بھی مُغتنم ہے
کچھ آئینِ اہلِ صفا جانتا ہے

ہمیں شیفتہ کی نصیحت سے حاصل!
کہ وہ آپ ہم سے سوا جانتا ہے

(۷)

ابھی کہوں۔ تو کریں لوگ شرمسار مجھے
کہ کس کے وعدے پر اتنا ہے انتظار مجھے

یہی گمان یہی رشک ہے اگر۔ تو کبھی
نہ کوئی دوست ملیگا نہ کوئی یار مجھے

قفس میں کرتی ہے تحریکِ بال جنبانی
نوائے دلکشِ مُرغانِ شاخسار مجھے

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو۔ آئے۔ کرے شکار مجھے

رہے سرائرِ مکتومہ دل ہی میں۔ افسوس!
جہان میں نہ ملا کوئی راز دار مجھے

جفا کو ترک کرو تم۔ وفا کو میں چھوڑوں
کچھ اشتہار تمھیں ہو۔ کچھ اشتہار مجھے

جو شورشیں نہ مچاتا۔ اسیر کیوں ہوتا!
خراب تو نے کیا۔ جلوۂ بہار مجھے

بڑے فساد اُٹھیں۔ شیفتہ! خدا نہ کرے!
کہ اُن کی بزم میں ہو دخل و اختیار مجھے

میرزا اسد اللہ خان غالب

اِن کے کلام میں فارسی الفاظ اور ترکیبوں کا استعمال بیشتر۔ مگر الفاظ کی شستگی اور ترکیب کی چُستی بے مثل۔ معانی کثیر کو الفاظِ قلیل میں بیان کرنا اِن کا خاصہ ہے۔ ابتدائے عمر میں دس برس تک بیدل و اسیر کے طرز پر خیالی مضامین لکھا کئے۔ جب تمیز آئی۔ اُس دیوان کو چاک کر ڈالا۔ دیوانِ حال میں کچھ نمونہ ابتدائی کلام کا موجود ہے +

(۱)

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا! — زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا!
بے نیازی حد سے گزری۔ بندہ پرور! کب تلک — ہم کرینگے عرضِ حال اور آپ فرمائینگے کیا؟
حضرتِ ناصح گر آئیں۔ دیدۂ و دل فرشِ راہ — کوئی مجھکو یہ تو سمجھادو۔ کہ سمجھائینگے کیا؟
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں — عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا؟
خانہ زادِ زلف ہیں۔ زنجیر سے بھاگینگے کیوں! — ہیں گرفتارِ وفا۔ زنداں سے گھبرائینگے کیا؟
ہے اب اِس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفت اسد — ہم نے یہ مانا۔ کہ دلی میں رہے۔ کھائینگے کیا؟

(۲)

یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اَور جیتے رہتے۔ یہی انتظار ہوتا
ترے وعدہ پر جیئے ہم۔ تو یہ جان جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے۔ اگر اعتبار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے۔ کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا! کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو۔ کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو۔ وہ اگر شرار ہوتا
کہوں کس سے میں۔ کہ کیا ہے شبِ غم بُری بلا ہے — مجھے کیا بُرا تھا مرنا۔ اگر ایک بار ہوتا
اُسے کون دیکھ سکتا۔ کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی۔ تو کہیں دوچار ہوتا
یہ مسائلِ تصوّف! یہ ترا بیان! غالب! — تجھے ہم ولی سمجھتے۔ جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۳)

ہوئی تاخیر۔ تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا؟
آپ آتے تھے۔ مگر کوئی عناں گیر بھی تھا؟

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اُس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو۔ تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا؟

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے۔ تو کیا!
بات کرتے۔ کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پیشہ میں عیب نہیں۔ رکھئے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے۔ پاس نہ آیا۔ نہ سہی!
آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا؟

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو۔ غالب!
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

(۴)

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانیگا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کہتے ہیں۔ جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
"جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر"

کام اُس سے آپڑا ہے۔ کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے۔ وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے۔ نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑونگا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ۔ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں۔ تو چاہئیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

غالب! نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

(۵)

کب سے ہوں (کیا بتاؤں!) جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

قاصد کے آتے آتے خط اِک اَور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں- جو وہ لکھینگے جواب میں

ہیں آج کیوں ذلیل! کہ کل تک تھی پسند
گستاخئ فرشتہ ہماری جناب میں

رَو میں ہے رخشِ عمر- کہاں (دیکھیٔے) تھمے!
نے ہاتھ باگ پر ہے- نہ پا ہے رکاب میں

اِتنا ہی مجکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا- کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں- پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں!

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

غالب! ندیم دوست سے آتی ہے بوے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بو تُراب میں

۶

قطع کیجے نہ تعلّق ہم سے
کچھ نہیں ہے- تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے! وہ مجلس نہیں- خلوت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو- جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں- غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں!
نہ سہی عشق- مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے- اے فلک نا انصاف!
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جاے اسد!
گر نہیں وصل- تو حسرت ہی سہی

(۷)

کوئی دن گر زندگانی اَور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اَور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں!
سوزِ غمہائے نہانی اَور ہے

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اَور ہے

دے کے خط مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اَور ہے

ہو چکیں غالب! بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اَور ہے

خواجہ حیدر علی - آتش

خواجہ حیدر علی نام - آتش تخلص - اِن کے والد دلّی سے لکھنؤ آئے - خواجہ کو اِبتدائے عمر سے شاعری کا چسکا لگا - شیخ مصحفی کے شاگرد ہوئے - غزل گوئی میں شیخ ناسخ سے مقابلہ رہا - اِن کے کلام میں لُطفِ محاورات اور گرمی و تاثیر بہ نسبت شیخ ناسخ کے زیادہ ہے *

(۱)

حُسنِ پری اِک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا
ہُشیار وہی ہے - کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

وہ شوخ نہاں گنج کی مانند ہے اُس میں
معمورۂ عالم جو ہے - ویرانہ ہے اُس کا

جو چشم - کہ حیراں ہوئی - آئینہ ہے اُس کی
جو سینہ - کہ صد چاک ہوا - شانہ ہے اُس کا

دل قصرِ شہنشہ ہے - وہ شوخ اُس میں شہنشاہ
عرصہ یہ دو عالم کا جلو خانہ ہے اُس کا

وہ یاد ہے اُس کی - جو بُھلا دے دو جہاں کو
حالت کو کرے غیر - وہ یارانہ ہے اُس کا

یوسف نہیں - جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہے - بیعانہ ہے اُس کا

آوارگیٔ نکہتِ گُل ہے یہ اِشارہ
جامہ سے وہ باہر ہے - جو دیوانہ ہے اُس کا

یہ حال ہوا اُس کے فقیروں سے ہویدا
آلودۂ دنیا جو ہے - بیگانہ ہے اُس کا

شکرانۂ ساقیٔ ازل کرتا ہے آتشؔ — بریز مۓ شوق سے پیمانہ ہے اُس کا

(۲)

برنگِ شمع جس نے دل جلایا تیری دوری میں — تو اُس نے منزلِ مقصود کو زیرِ قدم پایا
ہزاروں حسرتیں جائینگی میرے ساتھ دنیا سے — شرار و برق سے بھی عرصۂ ہستی کو کم پایا
سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اِس خرابہ میں — غنیمت جان۔ جو آرام تو نے کوئی دم پایا
نظر آیا تماشائے جہاں۔ جب بند کیں آنکھیں — صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جامِ جم پایا
ہوا ہرگز نہ خطِ شوق کا ساماں درست آتشؔ! — سیاہی ہو گئی نایاب۔ اگر ہم نے قلم پایا

(۳)

نہ بوریا بھی میسّر ہوا بچھانے کو — ہمیشہ خواب ہی دیکھا کئے چھپر کھٹ کا
مُطیعِ نفس نہ اللہ نے کیا مجکو — نہ میں نے پیرویِ غول کی۔ نہ میں بھٹکا
نہ پھول بیٹھ کے بالائے سرو۔ اے قمری! — چڑھی جو بانس کے اوپر۔ یہ کام ہے نٹ کا
عجیب بھول بُھلیّاں ہے غفلتِ ہستی — جسے کہ راہ ہوئی اُس سے۔ خوب ہی بھٹکا
عجب نہیں ہے۔ جو سودا ہو شعر گوئی سے — خراب کرتا ہے آتشؔ! زبان کا چٹکا

(۴)

اے چرخِ بے مروّت! بل بے تنک مزاجی! — خوش تیرے گھر میں دُو دن اک میہماں نہ ٹھیرا
برباد کر نہ ناحق۔ اے بادِ صرصر! اُس کو — بلبل کا آشیانہ برگِ خزاں نہ ٹھیرا
عُزلت گزینی کا جو میں نے کیا اِرادہ — کُنجِ لحد سے بہتر کوئی مکاں نہ ٹھیرا
پھونک آشیاں ہمارا۔ اے برقِ آتشِ گل! — رہنے کے قابل اپنے یہ بوستاں نہ ٹھیرا
میری ہی خاک پر کی مُنہ زوری اُس نے آتشؔ! — پھروں سمندِ قاتل ورنہ کہاں نہ ٹھیرا!

(۵)

مسافر کی طرح رہ خانہ بردوش
نہیں جائے اقامت دارِ فانی

یقیں ہے دیدۂ باریک بیں کو
کرے عینک طلب یہ ناتوانی

یہ مُشتِ خاک ہو مقبولِ درگاہ
صبا کی چاہتا ہوں مہربانی

سُفیدی مو کی ہو کافور ہرچند
کہیں مٹتا ہے یہ داغِ جوانی!

نہ خوش ہو فربہئ تن سے۔غافل!
سبک کرتی ہے مُردہ کو گرانی

موے جو پیشتر مرنے سے۔وہ لوگ
کفن سمجھے قبائے زندگانی

ہوا کوئی نہ حالِ دل سے آگاہ
رہی مشتاقِ گوش اپنی کہانی

خدا کے حکم سے ہے قوّتِ نُطق
کلام اپنا ہے ہاتف کی زبانی

مرا دیواں ہے۔اے آتش! خزانہ
ہر اک بیت اس میں ہے گنجِ معانی

(۶)

آنکھوں کو کھول۔اگر تو دیدار کا ہے بھوکا
چودہ طبق سے باہر نعمت نہیں ہے کوئی

یہ کیا سمجھ کے کڑوے ہوتے ہیں آپ ہم سے!
پی جائیے گا کس کو! شربت نہیں ہے کوئی

میں نے کہا۔کبھی تو تشریف لاؤ۔بولے
"معذور رکھئے۔وقتِ فرصت نہیں ہے کوئی"

دل لیکے جان کے بھی سائل جو ہو۔تو حاضر
حاضر جو کچھ ہے۔اُس میں حجت نہیں ہے کوئی

ہم شاعروں کا حلقہ حلقہ ہے عارفوں کا
نا آشنائے معنی صورت نہیں ہے کوئی

ہژدہ ہزار عالم دم بھر رہا ہے تیرا
تجکو نہ چاہے۔ایسی خلقت نہیں ہے کوئی

نازاں نہ حُسن پر ہو۔مہماں ہے کوئی دم کا
بے اعتبار ایسی دولت نہیں ہے کوئی

یوں بد کہا کرو تم۔یوں مال کچھ نہ سمجھو
ہمسا بھی خیر خواہِ دولت نہیں ہے کوئی

ماو شما۔ کہہ و مہ کرتا ہے ذکر تیرا	اس داستاں سے خالی صحبت نہیں ہی کوئی

(۷)

منزل ہی دور ہے۔ جو یہ پہنچی نہیں ہنوز	دم لینے والی راہ میں عمرِ رواں نہ تھی
دکھلائے سیر آنکھوں کو بامِ مراد کی	ایسی کوئی کمند۔ کوئی نردباں نہ تھی
نافہمی کی دلیل ہے یہ سجدہ سے ابا	ابلیس کو حقیقتِ آدم عیاں نہ تھی
افسوس کیا جوانیِ رفتہ کا کیجئے!	وہ کونسی بہار تھی! جس کو خزاں نہ تھی
نالوں سے ایک دن نہ کئے گرم گوشِ یار	آتش! مگر تمھارے دہن میں زباں نہ تھی

شیخ امام بخش ناسخ

شیخ امام بخش نام۔ ناسخ تخلص۔ لکھنؤ کے مشاہیر شعرا سے ہیں اور اپنے وقت کے اُستاد۔ میر تقی۔ مصحفی۔ انشا۔ جرأت کا اخیر زمانہ دیکھا تھا۔ خواجہ آتش کے ہمعصر تھے۔ کلام ان کا اصولِ فن کے مطابق نہایت جنچا تُلا۔ تشبیہ و تمثیل سے معمور۔ مگر دلاویزی و تاثیر کم +

(۱)

انسان کو انسان سے کینہ نہیں اچھا	جس سینہ میں کینہ ہو۔ وہ سینہ نہیں اچھا
آواز یہ آتی ہے لبِ آبِ بقا سے	"مرنا ہی یہاں خوب ہے جینا نہیں اچھا"
ہو سیر جو منظور (دلا!) بحرِ جہاں کی	جز کشتیٔ درویش سفینہ نہیں اچھا

(۲)

دشمنِ سر ہے تری گردن کشی مانندِ شمع	افسرِ زر شوق سے رکھ۔ پر نہ اتنا سر اُٹھا
زندگی میں صرف کر۔ تا ہو سبکدوشی حصول	مثلِ قاروں خاک میں جا کر نہ بارِ زر اُٹھا
چاہیئے تعمیرِ دل۔ جو ساتھ اُٹھا لیجائیگا	یوں خرابی کے لئے دیوار اُٹھا۔ یا در اُٹھا

بات جن نازک مزاجوں سے نہ اُٹھتی تھی کبھی
بوجھ اُن سے سیکڑوں من خاک کا کیونکر اُٹھا!
کیا سخن سنجی سے حاصل! جب سخنداں ہی نہیں
زانوے فکرت سے۔ اے ناسخ! تو اپنا سر اُٹھا

(۳)

ہو وطن میں خاک میرے گوہرِ مضموں کی قدر
لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر
ہوتی ہے غربت میں ثروت۔ پر بڑی ایذا کے بعد
رنج اُٹھائے کس قدر یوسف نے کنعاں چھوڑ کر
اعتماد اصلا نہیں۔ گر ہے جہاں زیرِ نگیں
اُٹھ گیا دنیا سے خاتم کو سلیماں چھوڑ کر
آج تو پوشاک پر مرتا ہے تو۔ کل دیکھیو!
جائیگا نباش تیری لاش عُریاں چھوڑ کر

(۴)

خوش قدوں کی خاک یہ اُٹھتی ہے ہر دم سرو قد
گرد باد۔ اے اہلِ غفلت! اس بیاباں میں نہیں
آج نقّاشی کی چھت لگوا۔ نہیں مانع کوئی
کل بجز خفّاش کوئی سقفِ ایواں میں نہیں
دوست۔ دشمن۔ سب کے سب ہیں فتنی مثلِ نسیم
گُل تو کیا! کانٹا بھی اک دن اس گلستاں میں نہیں
دُم دبا جاتے تھے جن کے سامنے شیرِ ژیاں
غیرِ روباہ و شغال اب اُن کے ایواں میں نہیں
بے وطن ہو کر زمانہ میں ہوے نالاں بشر
آشنا نالوں سے ہرگز نَے نیستاں میں نہیں

(۵)

دو روز ایک وضع پہ رنگِ جہاں نہیں
وہ کونسا چمن ہے ؟ کہ جس کو خزاں نہیں
حاصل تجھے بصارتِ یعقوب ہو اگر
یوسف بغیر کوئی یہاں کارواں نہیں
مُنعم کے شکر میں بھی ہلائیں کبھی کبھی
تنہا برائے لذّتِ دنیا زباں نہیں
پژمردہ ایک ہے۔ تو شگفتہ ہے دوسرا
باغِ جہاں میں فصلِ بہار و خزاں نہیں

(۶)

بیاں کیا ہو سکے عمرِ رواں کی مجھ سے چالاکی
کہ اس توسن سے لگا ہے نہ ترکی کو۔ نہ تازی کو

اکیلا دل مرا فوجِ تمنّا کے مقابل ہے
الٰہی کیجیو تو فتحیاب اس مردِ غازی کو

ثمر پختہ جو ہے (اے خام طبعو!) باغِ عالم میں
نہ کیونکر خاکساری سے وہ بدلے سرفرازی کو!

(۷)

"پا شکستہ جو ہے۔ کرتا ہے جہاں میں سلطنت"
یہ صدا آتی ہے ہر دم تربتِ تیمور سے

مُنعمِ موذی کے گھر کو اہلِ حاجت لوٹ لیں
مانگتا ہے کب کوئی جا کر عسل زنبور سے!

بانٹ لے کوئی کسی کا درد۔ یہ ممکن نہیں
بارِ غم دنیا میں اُٹھواتے نہیں مزدور سے

دیکھنا (اے اہلِ عبرت!) انتقامِ آسماں۔
بنتے ہیں جامِ گدا خاکِ سرِ فغفور سے

شیخ قلندر بخش جرأت

قلندر بخش نام۔ جرأت تخلص۔ اکبر آبادی مشہور ہیں۔ مگر ان کے والد دلّی کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں پہنچکر ان کی غزلوں نے شہرت پائی۔ عین جوانی میں نابینا ہو گئے۔ ۱۲۲۵ھ میں انتقال کیا۔ میر انشا اور مصحفی کے ہمعصر تھے۔ ان کے کلام میں میر کی سی سادہ بیانی اور لطفِ محاورہ تو ہے۔ مگر مضامین رندی و ہوا پرستی کی حد سے باہر کم نکلتے ہیں +

(۱)

غم رو رو کے کہتا ہوں کچھ اُس سے اگر اپنا
تو ہنس کے وہ بولے ہے۔ میاں! فکر کر اپنا

باتوں سے کٹے کس کی بھلا راہ ہماری!
غربت کے سوا کوئی نہیں ہم سفر اپنا

عالم میں ہے گھر گھر خوشی و عیش۔ پر اُس بن
ماتم کدہ ہم کو نظر آتا ہے گھر اپنا

ہر بات کا بہتر ہے چھپانا ہی۔ کہ یہ بھی
ہے عیب۔ کرے کوئی جو ظاہر ہنر اپنا

کیا کیا اُسے دیکھ۔ آتی ہے (جرأت!) ہمیں حسرت	مایوس جو پھر آتا ہے پیغامبر اپنا

(۲)

بلبل سُنے نہ کیونکہ قفس میں چمن کی بات!	آوارۂ وطن کو لگے خوش وطن کی بات
عیش وطرب کا ذکر کروں کیا میں۔ دوستو!	مجھ غمزدہ سے پوچھئے رنج و محن کی بات
شاید اُسی کا ذکر ہو۔ ہر رہگزر میں مَیں	سُنتا ہوں گوشِ دل سے ہر اک مرد وزن کی بات
جُرأت! خزاں کے آتے چمن میں رہا نہ کچھ	اِک رہ گئی زباں پہ گُل و یاسمن کی بات

(۳)

صَوتِ بلبل دلِ نالاں نے سُنائی مجکو	سَیرِ گُل دیدۂ گریاں نے دکھائی مجکو
لاؤں خاطر میں نہ میں سلطنتِ ہفت اقلیم	اُس گلی کی جو مُیَسّر ہو گدائی مجکو
صلح میں جس کی نہیں چین یہ اندیشہ ہے	آہ! دکھلائیگی کیا اُس کی لڑائی مجکو؟
وصل میں جس کے نہ تھا چین۔ سو جرأت! افسوس	وہ گیا پاس سے اور موت نہ آئی مجکو

(۴)

اِتنا بتلا مجھے ہرجائی ہوں میں۔ یار! کہ تو	مَیں ہر اک شخص سے رکھتا ہوں سروکار۔ کہ تو؟
کم ثباتی مری ہر دم ہے مخاطب بحباب	دیکھیں تو۔ پہلے ہم اِس بحر سے ہوں پار۔ کہ تو؟
ناتوانی مری گلشن میں یہ ہی کہتی ہے	دیکھیں۔ اے نکہتِ گُل! ہم ہیں سبکبار۔ کہ تو؟
دوستی کرکے جو دشمن ہوا تو جرأت کا	بیوفا وہ ہے۔ پھر اے شوخ ستمگار۔ کہ تو؟

(۵)

دی خبر پیکِ صبا نے کیا یہ گلشن میں جو آہ!	غنچۂ پژمردہ ساں دل کی کلی مُرجھا گئی
ضعفِ پیری روز اُس کا اِنتقام اب لے ہے آہ!	قبل ازیں عمرِ جوانی جو مزے دِکھلا گئی

اُس سے کیوں بچتے ہے۔ کیا سودا چڑھا تجکو۔ دلا!	وہ نہیں گر آپ میں۔ تو تو ہی لس کر جا گئی
اے اجل! بس یہ تو رسوائی نہ دیکھی جائیگی	طبع غمخواروں کی اپنے اب بہت اُکتا گئی
اب ڈھٹائی سمجھئے یا اِس کو جُرائت جانئے	آئینگے جی۔ آئینگے! اب تو طبیعت آ گئی

(۶)

مُشکل ہے۔ جو آوے وہ احاطہ میں خرد کے	گو اُس کا تصوّر کوئی اِدراک سے باندھے
دعوئے نہ کرے برق کبھی اپنی تڑپ کا	گر پانوں ترے توسنِ چالاک سے باندھے
قاتل ہو وہ سنکھ۔ تو ابھی ڈر کے یہ بھاگیں	جو تیغ و سپر پھرتے ہیں بے باک سے باندھے

سید انشاء اللہ خان انشا

انشاء اللہ خان نام۔ انشا تخلص۔ شرفاے دہلی سے تھے۔ استعداد علمی میں لائق و فائق۔ فارسی۔ عربی۔ ترکی سے ماہر۔ شیخ مصحفی نے اِن کو فیضی زماں لکھا ہے۔ کلام میں ہزل و ظرافت زیادہ ہے۔ مگر جو صاف و سنجیدہ ہے۔ وہ بے مثل و نظیر۔ میر و مصحفی و جرأت کے ہمعصر تھے۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ پُہنچے۔ ۱۲۳۳ھ میں بحالت دیوانگی اِنتقال کیا۔

(۱)

جس شخص نے کہ اپنے نخوت کے بل کو توڑا	راہِ خدا میں اُس نے گویا جبل کو توڑا
اپنا دلِ شگفتہ تالاب کا کنول تھا	افسوس تو نے ظالم! ایسے کنول کو توڑا
تھا ساعتِ فرنگی۔ دل چپ جو ہو رہا ہے	کیا جانئے کہ کس نے ہے اس کی کل کو توڑا
دارا و جم نے تجھ سے کیا کیا شکست پائی	اے چرخ! تو نے کس کس اہلِ دول کو توڑا
لینی ہے جنسِ دل تو ظالم! تو آج لے چک	پڑ جائیگا وگرنہ پھر اس کا کل کو توڑا
احوال خوش اُنہوں کا اِنشا میاں جنہوں نے	اُس ذاتِ بحت سے مل بندِ اجل کو توڑا

(۲)

جھوٹا نکلا قرار تیرا
اب کس کو ہے اعتبار تیرا
واللہ! کہ کام آ رہے گا
مجھ سا یک رنگ یار تیرا
کر جبر جہاں تلک تو چاہے
میرا کیا! اختیار تیرا
انشا سے نہ روٹھ۔ مت خفا ہو!
ہے بندۂ جاں نثار تیرا

(۳)

شعلے بھڑک رہے ہیں یوں اپنے تن کے اندر
دوں لگ رہی ہو جیسے گرمی میں بن کے اندر
جو چاہو تم۔ سو کہہ لو۔ چپ چاپ ہیں ہم ایسے
گویا زباں نہیں ہے اپنے دہن کے اندر
گل سے زیادہ نازک جو دلبرانِ رعنا
ق
ہیں ہیکلی میں شبنم کے پیرہن کے اندر
ہے مجکو یہ تعجب۔ سووینگے پانوں پھیلا
یہ رنگ گورے گورے کیونکر کفن کے اندر!
غم نے ترے بٹھایا۔ اے ماہِ مصرِ خوبی!
یعقوب وار ہم کو بیت الحزن کے اندر
یوں بولتا کہے ہے۔ سنتے ہو میرا انشا!
"ہیں طرفہ ہم مسافر اپنے وطن کے اندر"

(۴)

شادابیٔ ہوا میں یہ کیفیت اب کے ہے
سو رنگ کے شگفتہ ہیں گل شاخسار پر
نظارہ سوے دانۂ شبنم اگر کروں
جاتی ہے چٹ نگاہ پھسل سبزہ زار پر
اشجار جھومتے ہیں پڑے صحنِ باغ میں
تاک اینڈتے ہیں مست پڑے جوئبار پر
موجِ بہارِ لالۂ خود رو نے۔ اے نسیم!
کچھ آگ سی لگائی ہے آ کوہسار پر

(۵)

نکلے ہے خوں ٹھہر ٹھہر دل کے ہر اک خراش سے
چھیڑ دو اس کو دوستو! تیر قلم تراش سے

ہم کو مصاحبوں سے ہے آپ کے کیا برابری! ہم ہیں کمینہ اک غلام فرقۂ خواجہ تاش سے
موسمِ گُل ہے دوستو! جائے وہ سیرِ باغ کو اُٹھنے کی تاب جس کو ہو تکیہ گہِ فراش سے
حضرتِ عشق! دیر میں رہتے ہو یا حرم میں تم مجکو نہیں کچھ اطلاع آپ کی بود و باش کی
ہے یہ دو روزہ زندگی ہم کو وبالِ گردن آہ! اے وہ خوشا! جو چھُٹ گئے دغدغۂ معاش سے

(۶)

یہ جائے ترحم ہے۔ اگر سمجھے تو صیّاد میں اَور پھنسوں اس طرح اس کُنجِ قفس میں
آتی ہے نظر اُس کی تجلّی ہمیں زاہد! ہر چیز میں۔ ہر سنگ میں۔ ہر خار میں خس میں
کیا پوچھتے ہو؟ عمر کٹی کس طرح اپنی جز درد نہ دیکھا کبھی اِس تیس برس میں
ہر بات میں یہ جلدی ہے۔ ہر چیز میں اصرار دنیا سے نرالی ہیں غرض تیری تو رسمیں
انشا ترے گر گوش اَصم ہوں نہ۔ تو آوے آواز تجھے یار کی ہر بانگ جرس میں

(۷)

نبھ گئی بندۂ درگاہ سے اور آپ سے خیر! ہم اُلفت میں اگر ایسے ہی آئیں ہوئے
راہ رو! چونک۔ کہ ہے قافلہ میں تیاری محمل اونٹوں پہ بندھے۔ فوج میں سب زیں ہوئے
قمری و بلبلِ نالاں میں پڑے جو جھگڑے سو دلِ غمزدہ کے موجبِ تسکیں ہوئے
اشک آنکھوں سے قدم رکھ نہیں سکتے باہر دولتِ شرم سے مانندِ سلاطیں ہوئے
قصدِ بنگالہ مناسب ہی نہیں صاحب کو گرچہ معلوم تجارت کے سب آئیں ہوئے
جی ہی اچھا نہ رہا پھر۔ تو عیاذاً باللہ! فائدہ کیا! جو شناسائے اراکیں ہوئے

(۸)

کر بیٹھے وُہیں فضلِ خدا داد پہ تکیہ جب بن نہ پڑی بات کچھ اپنی تگ و دَو سے

جان اہلِ توکّل اُنھیں اشخاص کو۔ جو ہیں
محظوظ پیاز و نمک و گردۂ جو سے
اے دل! وہ خوشا کشتِ برومند کہ جس کو
خطرہ ہی نہیں تہلکۂ وقتِ درو سے
افواجِ گُل و لالہ میں ہے زلزلہ اِنشا
اِس بادِ بہاری کی سواری کی جلو سے

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

غلام ہمدانی نام۔ مصحفی تخلّص۔ وطن اصلی امروہہ۔ دلّی میں آکر علوم رسمیہ حاصل کئے۔ آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ پہنچے۔ اور ریختہ گوئی میں میر و سودا کے بعد عَلَمِ اُستادی بلند کیا۔ خود فرماتے ہیں ؎ اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں + دلّی میں بھی چوری میرا دیوان گیا تھا + اِن کا کلام نہایت صاف و شستہ ہے۔ کہیں بطرزِ سودا۔ کہیں بطرز میر +

(۱)

نظارہ کروں دہر کی کیا جلوہ گری کا!
یہاں عمر کو وقفہ ہے چراغِ سحری کا
کیا لُطف مقام اُن کو! جو مُشتاقِ عدم ہیں
دل کوچ میں رہتا ہے ہمیشہ سفری کا
کیا بھیجئے قاصد کو وہاں! کوچہ میں جس کے
جبریل کو مقدور نہیں نامہ بری کا
تربت پہ مری برگِ گُل تازہ چڑھائے
احسان ہے مجھ پر یہ نسیمِ سحری کا
بندہ ہے ترا۔ مصحفی خستہ کو یارب!
محتاج طبیبوں کی نہ کر چارہ گری کا

(۲)

بوئے محبّت اپنی رکھی خدا نے اُس میں
سینہ میں آدمی کے دل عطرداں بنایا
اپنی تو اِس چمن میں عمر اِس طرح سے گزری
یہاں آشیاں بنایا۔ وہاں آشیاں بنایا
گرمِ سفر رہے ہم۔ منزل کو پر نہ پہنچے
آوارگی نے ہم کو ریگِ رواں بنایا
اے مصحفی! گریباں سارا لہو سے تر ہے
یہ رنگ اپنا ظالم! تو نے کہاں بنایا؟

(۳)

ہے یہاں کس کو دماغ انجمن آرائی کا
اپنے رہنے کو مکاں چاہیئے تنہائی کا

شیشۂ دل کو مرے چور کیا کیوں اُس نے؟
کیا بگاڑا تھا بھلا گنبدِ مینائی کا؟

بھیج دیتا ہے خیال اپنا عوض اپنے مدام
کس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا!

مصحفیؔ! ریختہ پہنچا مرا کس رتبہ کو
شور یہاں گرد ہے مرزا کی بھی مرزائی کا

(۴)

کیا غیر کا کھٹکا ہے؟ کہ میں کچھ نہیں کہتا
یہ مُنہ مجھے تیرا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا

دیوانے جو ہوتے ہیں کہا کرتے ہیں کیا کیا
مجکو یہ ہی سودا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا

جو چاہتے ہیں۔ مجکو وہ کہتے ہیں۔ خدایا!
تو عالم و دانا ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا

اے مصحفیؔ! بعضے مرے کہنے کے ہیں قائل
بعضوں کا مقولہ ہے۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا

(۵)

بوئے خوں دیتا ہے کچھ مجکو یہ گلشن اے صبا
ہے شہیدوں کا یہاں کس کس کے مدفن اے صبا

کس کے ماتم میں ہوئے ہیں گُل ہزاروں سینہ چاک
بلبلیں کرتی ہیں کس کشتہ پہ شیون اے صبا

ہم اسیرانِ قفس کو تب خبر دی تو نے آہ!
لُٹ گئے جب باغ میں پھولوں کے خرمن اے صبا

ڈالکر شبنم کے مُندرے بے تکلّف کان میں
اب کے ہولی میں بنا گُل کو جوگن اے صبا

(۶)

معشوق ہوں یا عاشقِ معشوق نما ہوں
معلوم نہیں مجکو۔ کہ میں کون ہوں۔ کیا ہوں

ہوں شاہدِ تنزیہ کے رخسارہ کا پردہ
یا خود ہی میں شاہد ہوں۔ کہ پردہ میں چھپا ہوں

ہستی کو مری ہستیِ عالم نہ سمجھنا
ہوں ہست۔ مگر ہستیِ عالم سے جدا ہوں

انداز ہیں سب عاشق و معشوق کے مجھ میں
سوزِ جگر و دل ہوں۔ کبھی ناز و ادا ہوں

ہے مجھ سے گریبانِ گل و صبح معطّر
میں عطرِ نسیمِ چمن و بادِ صبا ہوں

گوشِ شنوا ہو۔ تو میری رمز کو سمجھے
حق یہ ہے۔ کہ میں سازِ حقیقت کی صدا ہوں

یہ کیا ہے۔ کہ مجھ پر مرا عقدہ نہیں کھلتا
ہر چند۔ کہ خود عقدہ و خود عقدہ کشا ہوں

اے مصحفی شایاں ہیں مری جلوہ گری میں
ہر رنگ میں میں مظہرِ انوارِ خدا ہوں

(۷)

چہرہ اُتر رہا ہے۔ نقشے بگڑ گئے ہیں
کچھ ان دنوں تو تیرے لچھن سے جھڑ گئے ہیں

تلوار سج کے جب وہ نکلا ہے گھر سے باہر
کشتوں کے ہر گلی میں ستھراؤ پڑ گئے ہیں

روتا پھروں نہ کیونکر میں قافلہ میں ہر سو
منزل پہ میرے ساتھی مجھ سے بچھڑ گئے ہیں

اے مصحفی میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو؟
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

(۸)

فلک کی تو نہیں ایسوں کی پرورش۔ ورنہ
شکستہ حال و غریب و فقیر ہم بھی ہیں

یہ درمیاں جو حسینوں بگاڑ رہتا ہے
وہی شریر نہیں۔ کچھ شریر ہم بھی ہیں

حسد کی جا نہیں اے مصحفی کلام اُن کا
کہ اپنے عہد کے مرزا و میر ہم بھی ہیں

(۹)

تو بہار آئی ہے۔ سودائے کہن تازہ ہوا
سبزہ کی موج نے پھر سلسلہ جنبانی کی

ہوں وہ غارت زدہ رہرو۔ کہ ہویدا ہے صاف
میری صورت سے حقیقت مری ویرانی کی

محو ہر دم جو رہے اپنی ہی آرائش کا
اُس کو کیا فکر مری بے سر و سامانی کی

مصحفی! دوں میں جہاں ریختہ گوئی کو رواج
قدر شیرازی کی ہو واں۔ نہ صفاہانی کی

میر محمد تقی - میر

حالات کے لئے دیکھو صفحہ ۲۰ حصّۂ نظم

(۱)

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا ؟ / آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا ؟
قافلہ میں صبح کے اِک شور ہے / یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا ؟
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سر زمیں / تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا ؟
یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں / داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا ؟
غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز / میر اِس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا ؟

(۲)

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا / جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا
اگرچہ عمر کے دس دن یہ لب رہے خاموش / سخن رہیگا سدا میری کم زبانی کا
ہزار جان سے قربان بے پری کے ہیں / خیال بھی کبھو† گزرا نہ پرفشانی کا
نمود کرکے وُہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا / کہے تو میر بھی اِک بلبلہ تھا پانی کا

(۳)

طریق خوب ہے آپس میں آشنائی کا / نہ پیش آئے اگر مرحلہ جُدائی کا
یہیں ہیں دیر و حرم۔ اب تو یہ حقیقت ہے / دماغ کس کو ہے ہر در کی جبہہ سائی کا
کسو* پہاڑ میں جوں کوہکن سر اب ماریں / خیال ہم کو بھی ہے بخت آزمائی کا
رکھا ہے باز ہمیں دربدر کے پھرنے سے / سروں پہ اپنے ہے احسان شکستہ پائی کا
جہاں میں میرہی کے ساتھ جاتا تھا۔ لیکن / کوئی شریک نہیں ہے کسو* کی آئی کا

† متروک کبھی مستعمل ۱۲
* متروک کسی مستعمل ۱۲

(۴)

مہر کی تجھ سے توقع تھی- ستمگر نکلا / موم سمجھے تھے تیرے دل کو- سو پتھر نکلا
دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی- کہ نہ پوچھ / جانا جاتا ہے- کہ اس راہ سے لشکر نکلا
اشکِ تر- قطرۂ خوں- لختِ جگر- پارۂ دل / ایک سے ایک عدد آنکھ سے بہتر نکلا
ہم نے جانا تھا لکھیگا تو کوئی حرف اے میر / پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

(۵)

مستوجبِ ظلم و ستم و جور و جفا ہوں / ہر چند کہ جلتا ہوں- پہ سرگرم وفا ہوں
اس گلشنِ دنیا میں شگفتہ نہ ہوا مَیں / ہوں غنچۂ افسردہ- کہ مردودِ صبا ہوں
گو طاقت و آرام و خور و خواب گئے سب / بارے یہ غنیمت ہے- کہ جیتا تو رہا ہوں
سینہ تو کیا فضلِ الٰہی سے سبھی چاک / ہے وقتِ دعا میر- کہ اب دل کو لگا ہوں

(۶)

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر / میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں
جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر / صد رنگ مری موج ہے- میں طبعِ رواں ہوں
دیکھا ہے مجھے جس نے- سو دیوانہ ہے میرا / میں باعثِ آشفتگیٔ طبعِ جہاں ہوں
ہوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے / اس باغِ خزاں دیدہ میں مَیں برگِ خزاں ہوں
رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بسکہ پریشاں / در پے نہ ہو- اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

(۷)

رکھئے گردن کو تری تیغِ ستم پر- ہو سو ہو / جی میں ہم نے یہ کیا ہے اب مقرر- ہو سو ہو
قطرہ قطرہ اشکباری تا کجا پیشِ سحاب / ایک دن تو ٹوٹ پڑ اے دیدۂ تر- ہو سو ہو

بند میں ناز و نعم ہی کے رہے کیونکر فقیر
یہ فضولی ہے۔ فقیری میں مُیَسَّر ہو سو ہو

صاحبی کیسی ہے جو تم کو بھی کوئی تم سا ملا
پھر تو خواری بے وَقاری بندہ پرور۔ ہو سو ہو

کہتے ہیں۔ ٹھیرا ہے تیرا اور غیروں کا بگاڑ
ہیں شریک اے میر ہم بھی تیرے۔ بہتر۔ ہو سو ہو

(۸)

وہ اپنی ہی خوبی پہ رہتا ہے نازاں
مرو یا جیو کوئی اُس کی بلا سے

نہ رکھی مری خاک بھی اُس گلی میں
کدورت مجھے ہے نہایت صبا سے

اگر چشم ہے۔ تو وہی عینِ حق ہے
تعجب تجھے ہے عجب ماسوا سے

ٹک اے مدعی چشمِ انصاف وا کر
کہ بیٹھے ہیں یہ قافیے کس ادا سے

نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت
کہو میر جی! آج کیوں ہو خفا سے

(۹)

اپنی ہستی حَباب کی سی ہے
یہ نمائش سَراب کی سی ہے

چشمِ دل کھول اُس ہی عالم پر
یاں کی اوقات خواب کی سی ہے

میں جو بولا کہا۔ کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے

(۱۰)

تصویر کے سے طائر خاموش رہتے ہیں ہم
جی کچھ اُچٹ گیا ہے اب نالہ و فغاں سے

جب کوندتی ہے بجلی تب جانبِ گلستاں
رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاکِ آشیاں سے

آنکھوں ہی میں رہے ہو۔ دل سے نہیں گئے ہو
حیراں ہوں میں۔ یہ شوخی آئی تمھیں کہاں سے

اِتنی بھی بدمزاجی! ہر لحظہ میر تم کو
اُلجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

میرزا رفیع سودا

میرزا محمد رفیع نام۔ سودا تخلص۔ ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ دِلّی اِن کا مولد و مسکن۔ ریختہ گوئی میں شاہ حاتم کے شاگرد۔ ۱۱۸۵ ہجری میں لکھنؤ چلے گئے۔ ۱۱۹۵ ہجری میں وہیں انتقال فرمایا۔ اِن کا کلام رنگا رنگ ہے۔ کہیں صاف و سادہ۔ کہیں تشبیہہ و استعارہ + فارسی ترکیبوں کا اِستعمال بخلاف میر کے زیادہ۔ اگرچہ اصنافِ سخن میں اُستاد مسلّم ہیں۔ مگر اِن کے قصائد اور ہجویں خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں +

(۱)

مقدور نہیں اُس کی تجلّی کے بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر صرفِ زباں کا

پردہ کو تعیّن کے درِ دل سے اُٹھا دے
کھُلتا ہے ابھی پل میں طلسماتِ جہاں کا

اِس گُلشنِ ہستی میں عجب دید ہے! لیکن
جب چشم کھُلی گُل کی۔ تو موسم ہے خزاں کا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

(۲)

گلہ لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا
لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے
کہ جن† نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

دماغ جھڑ گیا آخر نہ تیرا۔ اے نمرود!
چلانہ پشّہ سے کچھ بس تری خدائی کا

طلب نہ چرخ سے کر نانِ راحت اے سودا
پھرے ہے اپنا وہ کاسہ لئے گدائی کا

(۳)

لُطف۔ اے اشک! کہ جوں شمع گھُلا جاتا ہوں
رحم۔ اے آہِ شرربار! کہ جل جاؤں گا

قطرۂ اشک ہوں پیارے! مرے نظّارہ سے
کیوں خفا ہوتے ہو! پل مارتے ڈھل جاؤنگا

† متروک جس مستعمل ہے ۱۲

اِس مصیبت سے تو مت مجکو نکال اب گھر سے
تو کہے "آج ہی جا" میں کہوں "کل جاؤنگا"

چھیڑ مت بادِ بہاری! کہ میں جوں نکہتِ گُل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤنگا

کہتے ہیں وہ جو ہے سودا کا قصیدہ ہی خوب
اُن کی خدمت میں لئے میں یہ غزل جاؤنگا

(۴)

قاصدِ اشک آکے خبر کر گیا
قتل کوئی دل کا نگر کر گیا

دیکھئے! درماندگی اب کیا دکھائے
قافلہ یاروں کا سفر کر گیا

کیونکہ کوئی کھائے ترا اب فریب
حال مرا سب کو خبر کر گیا

ایک جو مانندِ گُل اِس باغ سے
خرّم و خنداں ہو گزر کر گیا

آن کے شبنم کی طرح دوسرا
شام سے رو رو کے سحر کر گیا

کیا تجھے اب فائدہ اِس فکر سے
ہر کوئی اک طرح بسر کر گیا

(۵)

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

حبابِ لبِ جو ہیں اے باغباں ہم
چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں

خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھائے
جو کچھ دوست اپنے سے ہم دیکھتے ہیں

مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سودا
اُسے تیرے کوچہ میں کم دیکھتے ہیں

(۶)

مجمر کا دخل کیا ہے محفل میں تفتگاں کی
بو داغِ دل کی اپنے ہم عود جانتے ہیں

اپنا چراغِ دل کا جس دم سے بجھ گیا ہے
ہم گھر کو آسماں کے پُر دود جانتے ہیں

آئینہ سازی اُن کو ہے کفر اے سکندر!
جو مردِ شکلِ ہستی نابود جانتے ہیں

جس خشت کو اُٹھا کر دیکھیں وہ چشمِ دل سے
صورت کو اپنی اُس میں موجود جانتے ہیں

کیا شکر کیا شکایت اپنی ہی شکل سے ہے
دونوں سے آپ کو ہم مقصود جانتے ہیں

عجز و غرور دونوں اپنی ہی ذات میں ہیں
ہم عبد سے جُدا کب معبود جانتے ہیں

ہم سر نوائیں کس کے آگے ؟ کہ بیدؔ آسا
اپنے قدم کو اپنا مسجود جانتے ہیں

(۷)

توہی کچھ اپنے سر پہ نہ یاں خاک کر گئی
شبنم بھی اس چمن سے صبا چشم تر گئی

کیجو اثر قبول۔ کہ تجھ تک ہماری آہ
سینہ سے ارمغاں لئے داغِ جگر گئی

دیوانہ کون گل ہے ترا جس کو باغ میں
زنجیر کرنے موجِ نسیمِ سحر گئی

خانہ خراب دل تو ہے۔ لیکن میں کیا کہوں
جیسی بلائے جان ہے یہ آنکھ گھر گئی

مت پوچھ یہ۔ کہ رات کٹی کیونکہ مجھ بغیر
اس گفتگو سے فائدہ پیارے! گزر گئی

ظالم کڑوڑ گل کا گریباں ہوا ہے چاک
ایک عندلیب گر اجل اپنی سے مر گئی

پروانہ کون سا نہ جلا شام کو۔ کہ شمع
روتی ہوئی نہ بزم سے وقتِ سحر گئی

(۸)

نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے (دیکھو تو) کچھ رہا بھی ہے

ترا غرور مرا عجز تا کجا۔ ظالم!
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

زبانِ شکوہ سوا اب زمانہ میں ہیہات!
کوئی کسی سے بہ دیگر آشنا بھی ہے

ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر ؟ صیاد!
چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہے؟

سمجھ کے رکھیو قدم خارِ دشت پر مجنوں!
کہ اس نواح میں سوداؔ برہنہ پا بھی ہے

خواجہ میر درد

خواجہ میر نام- درد تخلص- دہلی کے ارباب طریقت و ارشاد سے تھے- ان کا دیوان ریختہ نہایت مختصر ہے- غزلیات تمامتر عارفانہ- خوبی زبان و سادگی بیان کے لحاظ سے مقبول خاص و عام- میر و میرزا کے ہمعصر تھے- ۱۱۹۵ھ ہجری میں بعمر ۶۸ سال رحلت فرمائی +

(۱)

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کی رقم کا
حقا! کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

اُس مسندِ عزت پہ- کہ تو جلوہ نما ہے
کیا تاب ہے گزر ہووے تعقل کے قدم کا

بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن
آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب سے
اور دل میں بھروسا ہے تو ہے تیرے کرم کا

مانندِ حباب آنکھ تو اے درد! کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

(۲)

سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما
اِس طرف کو کبھو گزر نہ کیا

دیکھنے کو رہے ترستے ہم
نہ کیا تو نے رحم- پر نہ کیا

آپ سے ہم گزر گئے کب کے
کیا ہے! ظاہر میں گو سفر نہ کیا

کونسا دل ہے وہ؟ کہ جس میں آہ!
خانہ آباد! تو نے گھر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے- درد!
بے ہنر! تو نے کچھ ہنر نہ کیا

(۳)

لیکر ازل سے تا بہ ابد ایک آن ہے
گر درمیاں حساب نہ ہو سال و ماہ کا

رحمت قدم نہ رنجہ کرے گر تری ادھر
یارب ہے کون پھر تو ہمارے گناہ کا

شاہ و گدا سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں　　نے تاج کی ہوس - نہ ارادہ کلاہ کا
سو بار دیکھیں میں نے تری بیوفائیاں　　تس پر بھی نت غرور ہے دل میں نباہ کا
اے درد! چھوڑتا ہی نہیں مجکو جذبِ عشق　　کچھ کہربا سے بس نہ چلے برگِ کاہ کا

(۴)

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک! جستجو کریں　　دل ہی نہیں رہا ہے - جو کچھ آرزو کریں
تر دامنی پہ شیخ! ہماری نہ جا - ابھی　　دامن نچوڑ دیں - تو فرشتے وضو کریں
سرتاقدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم　　پر یہ کہاں مجال ہے جو کچھ گفتگو کریں
ہر چند آئینہ ہوں - پر اتنا ہوں ناقبول　　مُنہ پھیر لے وہ - جس کے مجھے روبرو کریں
نے گُل کو ہے ثبات - نہ ہم کو ہے اعتبار　　کس بات پر چمن! ہوسِ رنگ و بو کریں

(۵)

یاں عیش کے پردہ میں چھپی دل شکنی ہے　　ہر بزمِ طرب جوں مژہ برہم زدنی ہے
آگے جو بلا آئی تھی سو دل پہ ٹلی تھی　　اب کے تو مری جان ہی پر آن بنی ہے
اے درد! بتا کس سے کہوں رازِ محبت　　عالم میں سخن چینی ہے یا طعنہ زنی ہے

(۶)

دیکھئے جس کو یاں - اُسے اَور ہی کچھ دماغ ہے　　کرمکِ شب چراغ بھی گو ہر شب چراغ ہے
غیر سے کیا معاملہ؟ آپ ہیں اپنے دام میں　　قیدِ خودی نہ ہو اگر - پھر تو عجب فراغ ہے
حال مرا نہ پوچھئے - میں جو کہوں - سو کیا کہوں؟　　دل ہے سو ریش ریش ہی - سینہ - سو داغ داغ ہے
سُنتے ہیں یوں - کہ آہ تو ہم ہی میں چھپ رہا کہیں!　　اپنی تلاش سے غرض ہم کو ترا سراغ ہے
غفلتِ دل ہوئی مگر - پنبۂ گوشِ خلق درد!　　بلبلِ داستاں سرا ورنہ ہر ایک زاغ ہے

قصائد

امیر الشعرا منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی

تختِ کاغذ پہ ہوا صدر نشیں شاہِ قلم — دائرے طبل کی صورت ہیں الف شکلِ علم
ہیں جو یہ عرصۂ کاغذ پہ حروف و حرکات — یہی لشکر ہے۔ یہی فوج۔ یہی خیل وخدم
ہے فصاحت جو مصاحب۔ تو بلاغت ہے ندیم — وزرا مرتبہ و دبدبہ و جاہ و حشم
منتخب ہیں جو مضامیں۔ تو معانی ہیں لطیف — ہیں وہی گنج وخزائن۔ وہی دینار و درم
اہلِ دفتر نے جو کی کھولکے بستوں کو نشست — گردنِ منشئ گردوں ہوئی تسلیم کو خم
کبھی منصب۔ کبھی تقسیم میں دیں جاگیریں — شقّے لکھے گئے۔ ہونے لگے فرمان رقم
وقتِ دربار ہوا۔ جمع ہوئے مجرائی — عقل وفہم و خرد و ہوش وتدابیر و حکم
سامنے آنے لگے خیر طلب بہرِ سلام — مردھا تھا جو ادب کا۔ وہ پکارا پیہم
روبرو خسروِ جم جاہِ فلک فر کے نگاہ — تا ابد سلطنتِ پشت و پناہِ عالم
ہوئی مجرے سے بخوبی جو فراغت حاصل — مسندِ حکم ہوئی مطلعِ انوار قدم
روبرو دستخطِ خاص کو لایا کاغذ — حکمت الدولہ۔ جو تھا منشئ یاقوت رقم
عرضیاں گزریں۔ خلائق کے برآئے مطلب — لب ہوئے لعل فشاں۔ کھل گئے ابواب کرم
بعد اخبار کے پرچوں کی جو نوبت آئی — نئے مضمون کا اک پرچہ ہوا پیش اُس دم
کہ ملازم ہیں جو سرکار کے یہ دانش و وہم — درِ دولت پہ ہے ہنگامہ۔ لڑے ہیں باہم
بحث اِک بات کی دونوں میں پڑی ہے ایسی — کہ بہم گتھ گئے ہیں صورتِ خطِ توام

حکمِ عالی یہ ہوا- جلد کرو حاضرِ بزم — دیکھیں- کیا کہتے ہیں؟ خود دونوں میں ہم ہونگے بہم
حاضرِ بزم ہوئے وہ- تو ہوا یہ ایما — کیوں لڑے ہو؟ کیا سببِ جنگ ہے- آگاہ ہوں ہم
عرض دانش نے یہ کی- روزِ ابد تک قائم — یہ حکومت- یہ ایالت- یہ شہامت- یہ حشم
بندۂ خاص نے دیکھے ہیں ہزاروں انساں — حکمرانانِ زمانہ رؤسائے عالم
ایک حاکم ہے- فلک جاہ- خردمند- ذکی — صاحبِ علم و ہنر- معدنِ اخلاق و کرم
نام ہے **کلب علی خان** بہادر جم جاہ — جس کے خدام ہیں ہم مرتبۂ قیصر و جم
علم میں- حلم میں- جود و کرم و ہمت میں — ہے وہ یکتائے زمانہ سرِ اقدس کی قسم!
جس میں جو بات ہو- کیونکر اُسے کوئی نہ کہے — پیشِ انصاف گزیں حق کا چھپانا ہے ستم
میرے کہنے کو ذرا وہم نے باور نہ کیا — بلکہ مارا رہِ انکار میں منکر نے قدم
کہ کمالات کا حصر ایک میں ہے ناممکن — کارخانہ ہے خدا کا- نہیں خالی عالم
کیسے کیسے نہیں گزرے ہیں جہاں میں نامی؟ — خواجگانِ عربستان و صنادیدِ عجم
سارے عالم میں ہے سحباں کی فصاحت مشہور — سارے آفاق میں کسریٰ کی عدالت ہے عَلَم
کس کو معلوم فلاطوں کی نہیں ہے حکمت؟ — حکمِ نادر ہے عیاں- جلوہ نما عشرتِ جم
چار سو ہمتِ حاتم کا ہے آوازہ بلند — شش جہت پر ہے عیاں- سب سے جری تھا رستم
تو جو کہتا ہے- کہ ان سب سے ہے بڑھکر کوئی — زعمِ باطل ہے فقط- مانتے ہیں کب اسے ہم
میں یہ کہتا ہوں- میں دعویٰ میں ہوں اپنے صادق — ہیں دلائل- جو ہوں گوشِ شنوا گوشِ اصم
کچھ یہ سُنتا نہیں- انکار یہ باندھی ہے کمر — گفتگوئے طرفین آپ سُنیں ہو کے بہم

ہو گیا حکم- کہ ہاں محکمۂ بحث ہو گرم
ایک ایک بات کا ہو فیصلہ- لا ہو- کہ نعم

(۲)

فصلِ گُل آئی ہوا گلزارِ جنّت بوستاں
بڑھ کے رضواں سے ہیں ان روزوں دماغِ باغباں

ہر طرف گلہائے رنگا رنگ گلشن میں کھلے
جیسے صبحِ عید یکجا ہوں حسینانِ جہاں

خم نہیں شاخیں درختوں کی ہوا سے خاک پر
کر رہی ہیں سجدۂ شکرِ خدائے انس و جاں

"قم باذن اللہ" کہتی آئی گلشن میں بہار
جی اُٹھے جو ہو گئے تھے مُردہ دل وقتِ خزاں

جھوم کر آیا ہے ابرِ کوہساری باغ میں
رقص میں ہیں ہر روش طاؤس۔ ہو کر شادماں

لالہ کہتا ہے کہاں موسیٰ ہیں؟ آکر دیکھ لیں
صاف جلوہ ہے چراغِ طور کا مجھ سے عیاں

جھومنا مستوں کی صورت ہے درختوں کا بجا
نکہتِ گُل میں بھی ہے کیفِ شرابِ ارغواں

لالۂ احمر نے یاقوتی کی ڈبیا کی درست
نرگسِ شہلا نے رکھی مے فروشی کی دُکاں

داربستِ تاک میں خوشے نظر آنے لگے
جس طرح جُھرمٹ ستاروں کا فرازِ آسماں

سیمِ غنچہ کیوں نہ بیحد ہو زرِ گُل بے شمار
رکھتی ہے اکسیر کی بوٹی بہارِ بوستاں

ہر روش پر بیٹھی ہے بزاز بن کر خرّمی
جس طرف دیکھو کُھلی ہے سبز مخمل کی دُکاں

فیضِ شبنم نے دئیے اشجار کو آبی لباس
بر میں ہے مردم گیا کے جامۂ آبِ رواں

نوعروسانِ چمن کو ہے جواہر کا جو شوق
پہنچنے فیروزہ آیا ہے چمن میں آسماں

یوں ہے جُنبش میں ہوا سے ہر نہالِ سایہ دار
ہو خراماں جس طرح کوئی حسین دامن کشاں

ہے مبارک فال۔ کوئی ہونے والی ہے خوشی
ہر چراغِ لالہ جوشِ رنگ سے ہے گُل فشاں

جان پھولوں میں پڑی۔ زندہ ہوئی خاکِ چمن
ہے دمِ جاں بخشِ عیسیٰ یا نسیمِ بوستاں

قمریوں کا قول ہے "ہم ہیں طیورِ باغِ خلد"
سرو کہتا ہے۔ کہ میں ہوں طوبیٰ باغِ جناں

صحنِ گلشن میں نزاکت نے جمایا ہے یہ رنگ
مرغِ بو کا آشیاں ہے شاخِ گلبن پر کہاں

ہے بلندی و درازی اس قدر ہر شاخ میں
ہے محیطِ مشرق و مغرب برنگِ کہکشاں

پائے گر سورج مکھی کے سایہ میں تھوڑی جگہ
بھول جائے پھر جنبش مثلِ قطبِ آسماں

چودھویں کا چاند ہے۔ جو چاندنی کا پھول ہے
چادرِ مہتاب ہے فرشِ فضائے بوستاں

سیر کو جو آئے۔ اُس کا نافِ آہو ہو مشام
گیسوئے مُشکینِ سنبل بسکہ ہے عنبر فشاں

دیدۂ بیدارِ نرگس کا تو کیا مذکور ہے
خواب میں کرتا ہے سبزہ سیرِ گلزارِ جناں

ہے تبسّمِ غنچۂ گُل کا کہ تیغِ آبدار
نوک کی لیتے ہیں کانٹے یا چبوتے ہیں سناں

شمس العلما مولوی سیّد نذیر احمد صاحب

اگرچہ دیر سے ہیں مجتمع خواص و عوام
پر اس میں شک نہیں جلسہ ہے اب کا بے ہنگام

کسی طرف سے بھی آوازِ خوش نہیں آتی
کچھ ایسا بگڑا ہے نظمِ لیالی و ایّام

وہ بمبئی۔ کہ جو تھا مرکزِ تجارتِ ہند
وبا نے کر دیا گویا کہ اُس کا کام تمام

مقام۔ رت جگے رہتے تھے۔ جن میں ساری رات
وہ کر رہے ہیں پڑے بھائیں بھائیں اوّلِ شام

حکایتیں جو مصائب کی اُن کے سنتے ہیں
تو دونوں ہاتھوں سے لیتے ہیں ہم کلیجہ تھام

خدا ہی جانے۔ ہوئیں کتنی عورتیں بیوہ
خدا ہی جانے۔ ہوئے بچّے کس قدر ایتام

جلا وطن ہوئے کتنے۔ کہ جو نہ ٹھیر سکے
کوئی سلون کو بھاگا۔ کوئی گیا آسام

مگر پناہ نہیں آہوے حرم کو بھی
کہیں جہان میں۔ جس دم قضا بچھائے دام

مرا تو کرتے ہیں۔ لیکن نہ یوں۔ مفاجاةً
تپ آئی صبح کو۔ دن چڑھتے ہو گیا سرسام

ہوئی دوپہر۔ تو دنیا سے ہو گئے رخصت
کہ تپ کے ساتھ ہی آیا تھا مرگ کا پیغام

ہزاروں آدمی گر جاں بحق ہوئے۔ تو ہوئے
یہ کیا غضب ہے! ہوئی طب رہی سہی بدنام

علاج جتنے کئے۔ سب کے سب گئے بے سود
بتائیں جتنی تدابیر۔ سب رہیں ناکام

بس اب کھلا۔ کہ طبابت کی اتنی ہستی ہے　　کہ جھٹ سے لکھدیا خیسانده ازبرائے زکام
سکنجبین کو فرمایا قاطعِ صفرا　　مریضِ یبُس کو بتلایا روغنِ بادام
بنی جب آن کے جانوں پہ اور رہے عاجز　　تو ایسی طب کو سلام اور سلام اور سلام
دوا کا حیلہ ہے۔ گر وقت ابھی نہیں آیا　　تو ہوتے دیکھا ہے چٹکی سے خاک کی آرام
اور آن پہنچا ہے وعدہ۔ تو بس سمجھ رکھو　　دعا۔ دوا۔ کوئی تدبیر بھی نہ آئے کام
اِدھر وبا نہیں۔ پر قحط اور گرانی سے　　مچا ہوا ہے ہر اک گھر میں رات دن کہرام
غلط۔ کہ عید ہوئی۔ کوئی ہم کو سمجھا دے　　یہ فاقے کیسے ؟ اگر ہو چکا ہے ماہِ صیام
ہمیں تو بے زری اور مفلسی نے مار دیا　　وگرنہ کیا تھا۔ جو ہوتے گرہ میں اپنی دام
وبا و قحط سے باقی تھا کیا اُجڑنے میں ؟　　مگر بھلے کو نگہبانِ خلق تھے حکّام
کجا فراغ! خوشی کیسی! کس کا اطمینان!　　اِن آفتوں کے سبب ہو رہی ہے زیست حرام
پھری ہوئی ہے خدا کی نظر کچھ ان روزوں　　کہ ہم نے توڑے ہیں اُس کے ضوابط و احکام
بساط یہ ہے۔ اور اِس پر گناہ کی جُرأت　　نمود یہ ہے۔ اور اِس پر قصور کا اِقدام
سوائے توبہ نہیں کچھ علاجِ قہرِ خدا　　طبیب ہو کہ طبابت۔ کسی پہ کیا الزام!
وہ چاہے مار دے ہم سب کو بے وبا بے قحط　　بقا تجھی کو ہے۔ اے ذوالجلال والاکرام!
گناہگار ہیں۔ پر معترف قصور کے ہیں　　وسیع ہے تری رحمت۔ کرم ہے تیرا عام
جئیں۔ تو خوش جئیں۔ اور امن و عافیت سے جئیں　　جب آئے موت۔ تو سب کا بخیر ہو انجام

حکیم مومن خان۔ مومن

کوئی اس دور میں جئے کیونکر　　مَلَکُ الموت ہے ہر ایک بشر
داد خواہوں کے شور سے۔ دیکھو　　چونک پڑتا ہے فتنۂ محشر

آئینہ نے بھی اس زمانہ میں
ہے پئے اشتیاقِ ویرانی
نہ امیروں کو پاسِ بندیِ عدل
اُس کو سو رستمِ زماں کا خطاب
چمن آرا کو رسمِ پیرائش
پاکے اِلزام دستِ خالی سے
آب و ناں کے لئے گرو رکھیں
شعرا کو یہ آرزوے شعیر
کام آئے نہ نغمۂ شیریں
سرورانِ سپہر مرتبہ ہیں
واعظوں کی زباں پہ آتا ہے
کہے مُفتی سؤال کو واجب
پھلے پھولے ہیں بے خرد۔ کیا دورؔ
سختی و کاہلی کی دولت سے
باندھتے ہیں سخن سرا موزوں
قدر دانی کا نام ہی نہ رہا
ایک امیرِ سخن شناس نہیں
اے لبِ یاوہ گوے ہرزہ دراے
ہجو گوئی نہیں ہمارا کام

تیغ کے سے نکالے ہیں جوہر
شاہ فرہاد و بے سُتوں کشور
نہ رعایا مطیع و فرماں بر
جو کرے قتل خرد سالہ پسر
اِک بہانہ ہے بہرِ قطعِ شجر
فلسفی پیٹتا ہے اپنا سر
رستمانِ زمانہ تیغ و سپر
خوانِ عیسیٰ ہے نیم خوردۂ خر
طوطیوں کو ہے حسرتِ شکر
بسکہ جاہل نواز دوں پرور
برملا شکوۂ قضا و قدر
کسب مفقود جو ہوئے یکسر
بیدِ مجنوں بھی گر لے آئے ثمر
دامنِ کوہ میں ہیں لعل و گہر
کس طرح ہو نصیب سروِ کو بر
چند ناداں ہوئے ہیں نام آور
لاکھ ہیں شاعرِ ثنا گستر
بس کہاں تک یہ ناستودہ سہر
ایسی باتوں سے خامشی بہتر

میرزا اسد اللہ خان غالب

ہاں مہِ نو! سُنیں ہم اُس کا نام
جس کو تو جُھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب؟
بندہ عاجز ہے۔ گردشِ ایّام

اُڑکے جاتا کہاں ہے؟ کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص!
حبّذا اے نشاطِ عامِ عوام!

عذر میں تین دن نہ آنے کے
لیکے آیا ہے عید کا پیغام

اُس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا
صبح جو جاے اور آئے شام

ایک میں کیا ہے؟ کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟
مجکو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام؟

جانتا ہوں۔ کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے اُمید گاہِ انام

میں نے مانا۔ کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالب اُس کا مگر نہیں ہے غلام؟

جانتا ہوں۔ کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرزِ اِستفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو۔ اے ماہ
قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجکو کیا پایہ روشناسی کا
جز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں۔ کہ اُس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن۔ ماہتاب بن۔ میں کون!
مجکو کیا بانٹ دیگا تو اِنعام؟

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
اَور کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص
گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشیگا تجکو فرِّ فروغ　　کیا نہ دیگا مجھے مئے گلفام
جب کہ چودہ منازلِ فلکی　　کر چکے قطع تیری تیزیٔ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر　　کوہی و مشکوے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز　　اپنی صورت کا اِک بلوریں جام
کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ　　اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جس کے در پے ناصیہ سا　　ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا۔تو مجھ سے سُن　　نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ　　مظہرِ ذوالجلال والاکرام

شیخ ابراہیم ذوق

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خواب راحت　　نشۂ علم میں سرمستِ غرور و نخوت
مزے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے　　تھا تصوّر میرا ہر امر میں تصدیق صفت
جو مسائل نظری تھے وہ بدیہی تھے تمام　　عقل کو تجربہ کی اتنی ہوئی تھی کثرت
ذہن میں سب مرے حاضر صُوَرِ علمیّہ　　پر جتانی نہ تھی منظور مجھے علمیّت
چار و ناچار جو ترغیب سے یاروں کے کبھی　　درس و تدریس پہ آجاتی تھی مجکو رغبت
کبھی ہمّت تھی مری قاعدۂ صرف میں صرف　　کبھی تھی نحو میں ہر نحو مجھے محویّت
کبھی میں کرتا تھا تصریحِ معانی و بیاں　　کبھی میں کرتا تھا توضیحِ نجوم و ہیئت
کبھی تھا علمِ الٰہی کی طرف ذہن رسا　　کبھی کرتی تھی طبیعی میں طبیعت جودت
کبھی تھی عرصۂ تدویرِ فلک کی مجھے سیر　　کبھی میں ناپتا تھا سطحِ زمیں کی وُسعت
کبھی ثابت مرے نزدیک فلک کی گردش　　کبھی مثبت مرے نزدیک زمیں کی حرکت

کبھی منقول پے مائل کبھی سوئے معقول — کبھی میں فقہ پے راغب کبھی سوئے حکمت
کبھی میں کرتا تھا قانون سے تشریحِ علاج — کبھی میں کرتا تھا قاموس میں تصحیحِ لغت
کبھی میں لون سے بینندۂ بیمار و صحیح — کبھی میں نبض سے دانندۂ ضعف و قوّت
گہ نباتات کی آگاہ میں کیفیّت سے — گہ جمادات کی معلوم مجھے خاصیت
جوں مہندس کبھی مالوف بہ شکل و مقدار — جوں محاسب کبھی مصروف بہ ضرب و قسمت
کبھی کرتا تھا قرانِ مہ و زہرہ پہ نظر — کبھی تھا دیکھتا مریخ و زحل کی رجعت
کبھی تھا علمِ قیافہ میں یہ ادراک مجھے — ایک صورت سے بیاں کرتا تھا میں سو سیرت
کبھی میں شاعرِ غرّا و ادب دانِ بلیغ — نظم میں نام مرا نثر میں میری شہرت
کبھی کرتا تھا عروضی کا بھی میں قافیہ تنگ — طبع موزوں کی دکھاتا تھا جو موزونیت
کبھی پیشِ نظر انجیل و زبور و توریت — کبھی مصحف میں نظر میری سرِ ہر آیت
کبھی یہ آگہی شاستر و بید و پُران — کروں اک بات سے پنڈت کی کتھا میں کھنڈت
آخرش دیکھا۔ تو العلم حجاب الاکبر — عاقبت پایا۔ تو ہاں اُبلہ کو اہلِ جنّت
فائدہ کیا ہے کہ جو ہر علم کی جانی تعریف — فائدہ کیا ہے جو ہوئی آگہی ہر ملّت
بے مقدر نہ پڑے صورتِ بہبود نظر — دور آئینۂ دل سے نہ ہو زنگِ کُلفت

(۲)

واہ وا! کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا! — مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا
بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار! — بن گیا گلزارِ عالم رشکِ صد دار الشفا
ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہمِ زخمِ جگر — شاخِ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا
ہوگیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق — لالہ بے داغِ سیہ پانے لگا نشو و نما

ہوگیا زائل مزاجِ دہر سے یہانتک جنوں / بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا
ہوتا ہے لُطفِ ہوا سے اِس قدر پیدا لہو / برگ میں ہر نخل کے سُرخی ہے جوں برگِ حنا
پائی یہ اصلاح صفرا نے کہ دنیا میں کہیں / زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا
ہر مزاجِ بلغمی میں ہوتی ہے تولیدِ خوں / چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا
نام کو اشیا میں نئے تلخی رہی نئے سمیت / بنگئی تریاک افیوں۔ زہر میٹھا ہو گیا
کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم / نیش کی جا نوش حنظل دیوے شربت کا مزا
نیش کی جا نوش ہو دنبالۂ زنبور میں / کام میں افعی کے ہو مہرہ بجائے آبلہ
راحت و آرام کا اِس دَور میں ہے دور دَور / چاہئے واقف نہ ہو دَورانِ سر سے آسیا
موتیا بند آنکھ میں اپنے جو رکھتی ہے صدف / اب رکھے ہے روشنی مثلِ دلِ اہلِ صفا
آ گیا اِصلاح پر ایسا زمانہ کا مزاج / تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرفِ دوا
نسخہ پر لکھنے نہیں پاتا ہو الشافی طبیب / کہتا ہے بیمار بس کر مجکو ہے بالکل شفا
فرق جاتا یہانتک اعضاے بدن سے درد کے / درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں سب جُدا
لاغروں کو ہو کمالِ تاب و طاقت یہ شتاب / کیسے دو ہفتے ہلال اک شب میں ہو بدرالدجیٰ
صُبحِ صادق کے ہے گو سر میں سپیدی آ گئی / لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا
بھوک کی شدت سے اُس کو اک نفس فرصت نہو / قرص سے خورشید کے جب تک نہ کر لے ناشتا
رات بھر ٹھونکا کیا انجم کے تارے چرخ پیر / پھر جو دیکھا صبح کو۔ اصلا شکم میں کچھ نہ تھا
پہنچی یہ تفتیح کی نوبت۔ کہ نوبتخانہ میں / لیتی ہے جی کھولکر کیا کیا ڈکاریں کرنا
پوست پھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے / جوں حباب اُس کے نہیں مطلق شکم میں امتلا
ہضم کامل اس قدر معدہ نے پہنچایا بہم / جیّد الکیموس ہے جو حلق سے اُتری غذا

ہے مزاج اہلِ عالم یہ قریبِ اعتدال
ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بخطِ استوا

رکھیگا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس
باغِ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا

دیگا طاؤس اپنے بال و پر سے سارے نقش دھو
پھینک دیگی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختا

(۳)

پائے نہ ایسا ایک بھی دن خوشتر آسماں
کھائے اگر ہزار برس چکر آسماں

ہے بادۂ نشاط و طرب سے لبالب آج
اِک عمر سے پڑا تھا تہی ساغر آسماں

دیکھے نہ اِس طرح کا تماشا جہان میں
گر ہو تمام چشم تماشاگر آسماں

اِترا رہا ہے عطر سے عیش و نشاط کے
سچ ہے زمیں پہ پاؤں رکھے کیونکر آسماں

افراطِ انبساط سے ہے کیا عجب۔ اگر
مثلِ حباب جامے سے ہو باہر آسماں

شادی کی اُس کی دھوم ہے آج آسمان تک
تابع زمانہ جس کا ہے فرماں بر آسماں

فرزندِ شاہ یعنی جواں بخت ذی وقار
تسلیم کو ہے جس کے جُھکا تا سر آسماں

ہے اُس کی بارگاہ میں مانندِ چوبدار
حاضر عصائے کاہکشاں لیکر آسماں

اِس بیاہ کی نوید سے ہے اِس قدر سرور
ہے پیر۔ پر جوانوں سے ہے بہتر آسماں

پھرتا ہے اہتمام میں شادی کے رات دن
مقدور کیا! کہ ٹھیر سکے دم بھر آسماں

فردِ حساب صرف سے اِس بیاہ کی ہو کم
گو لاکھ جمع و خرچ کا ہو دفتر آسماں

خواجہ الطاف حسین حالی

ہے عید یہ کس جشن کی یارب۔ کہ سراسر
ہے جیوبلی ہے جیوبلی اک ایک کی زباں پر

یہ عہد کہ گزرے ہیں برس جس کو پچاس اب
ست جُگ سے ہے یہ ہند کے حق میں کہیں بہتر

وہ دورِ تعصب تھا۔ یہ ہے دورۂ اخلاق
وہ جنگ کا موجد تھا۔ یہ ہے صلح کا رہبر

اِس دورِ خجستہ میں وہ سب بجھ گئے شعلے / تھی جن کی جہاں سوز لپٹ آگ سے بڑھکر
اِس عہد نے وہ خون بھرے ہاتھ کئے قطع / جو پھیرتے تھے بیٹیوں کے حلق پہ خنجر
بیٹوں کی طرح چاہتے ہیں بیٹیوں کو اب / جو لوگ روا رکھتے تھے خونریزیٔ دختر
جب بیٹیوں نے زندگی اِس طرح سے پائی / دی زندگی ایک اَور اُنھیں علم پڑھاکر
اِس عہد نے کی آکے غلاموں کی حمایت / انساں کو نہ سمجھا کسی انسان سے کمتر
دی اُس نے مٹا ہند سے یوں رسم ستی کی / گویا وہ ستی ہوگئی خود عہدِ کہن پر
نابود کیا اُس نے زمانہ سے ٹھگی کو / ایک قہر تھا اللہ کا جو نوعِ بشر پر
اِس عہد میں انساں ہی نہیں ظلم سے محفوظ / مظلوم نہ اب بیل۔ نہ گھوڑا ہے۔ نہ خچر
اے نازشِ برطانیہ۔ اے فخرِ برنزک / اے ہند کے گلّہ کی شباں۔ ہند کی قیصر
سچ یہ ہے کہ فاتح کوئی تجھ سا نہیں گزرا / محمود نہ تیمور۔ ہنیبل نہ سکندر
تسخیر فقط اگلوں نے عالم کو کیا تھا / اور تو نے کیا ہے دلِ عالم کو مسخّر
بند اپنے فرائض میں مسلماں ہیں۔ نہ ہندو / معمور مساجد ہیں۔ تو آباد ہیں مندر
بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹا / سنکھ اور اذاں گونجتے ہیں روز برابر
گو منتِ قیصر سے ہے ہر قوم گرانبار / احساں مگر اسلام پہ ہیں اُس کے گراں تر
اب ہند میں کشمیر سے تا راس کماری / ہر قوم کے ہیں پیر و جواں متفق اس پر
اُمید نہیں ہند کے راحت طلبوں کو / راحت کی کسی سایہ میں جز سایۂ قیصر
گر برکتیں اِس عہد کی سب کیجیے تحریر / کافی ہے نہ وقت اُس کے لئے اور نہ دفتر
ہے اب یہ دعا حق سے کہ آفاق میں جب تک / آزادی و انصاف حکومت کے ہیں رہبر
قیصر کے گھرانے پہ رہے سایۂ یزداں / اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایۂ قیصر

قطعات

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱) بے تمیزی ابنائے زماں

از رہِ فخر آبگینہ سے یہ ہیرے نے کہا
جنس تیری کس مپرس اور قدر و قیمت تیری ہیچ
دے کے دھوکا تو اگر الماس بن جائے تو کیا!
مُسکرا کر آبگینہ نے یہ ہیرے سے کہا
مجھ میں اور تجھ میں مگر کر سکتے ہیں جو امتیاز
تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں
ہے وجود اے مبتذل تیرا برابر اور عدم
تیرے پانے کی خوشی کچھ اور نہ گم ہونے کا غم
امتحاں کے وقت کھُل جاتا ہے سب تیرا بھرم
گو کہ ہے رُتبہ ترا مجھ سے بڑا اے محترم
ہیں مبصّر ایسے اِس بازارِ ناپُرساں میں کم
تجھ سے اے الماس لیکن اچھّے پڑ رہتے ہیں ہم

(۲) جس قوم میں افلاس ہو اُس میں بخل اتنا بدنما نہیں جتنا اسراف

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اِس کا سبب کیا
لیکن بخلاف آپ کے سب اگلے سخنور
اسراف بھی مذموم ہے۔ پر بخل سے کمتر
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اِس کا
کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اُس وقت
وہ جانتے تھے قوم ہو جس وقت تونگر
اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت ہے نہ اقبال
جب کرتے ہو تم کرتے ہو مُسرف کی مذمّت
جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلوں کو ملامت
ہے جس سے کہ انسان کو بالطبع عداوت
یاروں کے لئے ہے یہ بیاں موجبِ رقّت
جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت
پھر اُس میں نہیں بخل سے بدتر کوئی خصلت
گھر گھر پہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت

ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی
پرواز کی ہے چیونٹوں کو جیسے ہدایت

(۴۲) بے اعتدالی

تم اے خود پرستو! طبیعت کے بندو!
ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے

نہیں کام کا تم کو اندازہ ہرگز
جدھر ڈھل گئے۔ ہو رہے بس اُدھر کے

جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت
تو چیخ اُٹھے دو دن میں ہمسائے گھر کے

جو مجرے میں بیٹھو۔ تو اُٹھو نہ جب تک
کہ اُٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے

اگر پل پڑے چوسر اور گنجفہ پر
تو فرصت ملے شاید اب تم کو مر کے

پڑا مرغ بازی کا لپکا۔ تو جانو
کہ بس ٹھن گئے عزمِ جنگِ تتر کے

چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر
تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے

جو ہے تم کو کھانے کا چسکا۔ تو سمجھو
کہ چھوڑینگے اب آپ دوزخ کو بھر کے

جو پینے پہ آؤ۔ تو پی جاؤ اِتنی
رہیں پانوں کے ہوش جب ہیں۔ نہ سر کے

جو کھانا تو بیحد۔ جو پینا تو اَتّ گت
غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے

میرزا اسد اللہ خان غالب

(۱)

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پانوں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اِکلیل

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے عالم پہ کھُلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

بسخن اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ
بکرم داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر | تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر | زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل
تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہیں | تیری بخشش میرے انجاحِ مقاصد کی کفیل
تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید | تیرا اندازِ تغافل میرے مرنے کی دلیل
بختِ ناساز نے چاہا۔ کہ نہ دے مجکو اماں | چرخِ کجباز نے چاہا۔ کہ کرے مجکو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ | پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخُنِ تدبیر میں کیل
تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم | کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل
فکر میری گہُر اندوزِ اشاراتِ کثیر | کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح | میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل
نیک ہوتی میری حالت تو نہ دیتا تکلیف | جمع ہوتی میری خاطر تو نہ کرتا تعجیل
قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر | کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

(۲)

اے شاہِ جہانگیر۔ جہاں بخش۔ جہاندار | ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو | تو وا کرے اُس عقدہ کو۔ سو بھی باشارت
ممکن ہے کہ کرے خضر سکندر سے ترا ذکر | گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت
آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا | ہے فخرِ سلیماں۔ جو کرے تیری وزارت
ہے نقشِ مریدی ترا فرمانِ الٰہی | ہے داغِ غلامی تیرا توقیعِ امارت
تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں | تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت
ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی | باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر؟ قاصر ہے حکایت میں تری میری عبارت
نوروز ہے آج۔ اور وہ دن ہے۔ کہ ہوئے ہیں نظارگیٔ صنعتِ حق اہلِ بصارت
تجکو شرفِ مہر جہانتاب مبارک غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

شیخ ابراہیم ذوق

(۱)

خسروا! حسن کے ترا مژدۂ جشنِ نوروز آج ہے بلبلِ تصویر تلک زمزمہ سنج
خبرِ عیش تری دے ہے چمن کو جاکر زرِ گل پیکِ صبا پائے نہ کیونکر یارنج
بادۂ جوشِ جوانی کی ہے گویا اک موج تنِ پیرانِ کہن سال پہ ہر چین شکنج
چند قطرے سے ہیں شبنم کے وہ بلکہ کمتر آگے ہمت کے تری گوہرِ شہوار کے گنج
حسنِ نیت سے ہے تو یوسفِ مصرِ بخشش دستِ حاتم میں بجا ہے۔ کہ جو دیں تیغ و ترنج
شش جہت پر ہے جو غالب ترا سرپنجۂ امن فتنے کو اُٹھنے میں جوں نرد ہے کیا کیا شش و پنج!
نہ بجھے آب سے آتش۔ نہ خس آتش سے جلے ایک سے ایک موافق۔ کہ مرجان و مرنج
تیرے منصوبے کے تابع ہیں سب احکامِ نجوم صفحہ تقویم کا گویا ہے بساطِ شطرنج
لایا ہے معنی رنگیں سے یہ لعلِ خوشرنگ ذوق جو مدح و ثنا میں ہے تری گوہر سنج
خسروا ہوتا ہے اس رنگ سے معلوم یہ رنگ رنگ نوروز جو ہے اب کے برنگِ نارنج

بزمِ رنگیں میں تری رنگِ طرب ہو ہر روز
اور ترے خاطرِ اقدس پہ کبھی آئے نہ رنج

مسدسات

میر ببر علی انیس

میر ببر علی نام۔ انیس تخلص۔ میر حسن دہلوی کے نامور پوتے۔ لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی اِن کی چار دانگ ہند میں مشہور و مسلم تھی۔ فصاحت بیان اور لطافتِ محاورہ میں اِن کا کلام اُس پایۂ بلند پر پہنچا ہے۔ کہ جس کی نظیر نہیں +

صفتِ صُبح

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح
ہونے لگا اُفق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح
ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں
چُن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گُلِ مہتاب پر خزاں
مُرجھا کے گر گئے ثمرِ شاخِ کہکشاں
دکھلائے طور بادِ سحر نے سَموم کے
پژمُردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجُوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا۔ وہ صبح کا ظہور
یادِ خدا میں زمزمہ پردازیِ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا۔ وہ فضا۔ وہ نور
خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سُرور
اِنساں زمیں پہ محو۔ ملک آسمان پر
جاری تھا ذکرِ قدرتِ حق ہر زبان پر

وہ سرخیِ شفق کی اُدھر چرخ پر بہار
وہ بارور درخت۔ وہ صحرا۔ وہ سبزہ زار

+

شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار

نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

غریب الوطنی

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں
راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں
سو شغل ہوں پر دھیان لگا رہتا ہے گھر میں
پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں

سنگِ غمِ فرقت دلِ نازک پہ گراں ہے
اندوہ غریب الوطنی کاہشِ جاں ہے

گو راہ میں ہمراہ بھی ہو راحلہ و زاد
جاتی نہیں افسردگیٔ خاطرِ ناشاد
جب عالمِ تنہائی میں آتا ہے وطن یاد
ہر گام پہ دل مثلِ جرس کرتا ہے فریاد

اِک آن غم و رنج سے فرصت نہیں ہوتی
منزل پہ بھی آرام کی صورت نہیں ہوتی

ہمراہ سفر میں ہوں اگر حامی و ناصر
منزل پہ کمر کھولکے سوتے ہیں مسافر
جب ہو سفرِ خوف و پریشانیٔ خاطر
شب جاگتے ہی جاگتے ہو جاتی ہے آخر

ہر طرح مسافر کے لئے رنج و تعب ہے
رہ جائے پس قافلہ تھک کر تو غضب ہے

دکھ دیتے ہیں ایک ایک قدم پاؤں کے چھالے
منزل پہ پہنچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے
ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے
ڈر ہے۔ کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے

واماندوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی
تھک کر بھی جو بیٹھے۔ تو اُٹھاتا نہیں کوئی

صفت تیغ

تھا صورتِ آئینہ تمام اُس کا بدن صاف | خوں پیتی تھی پر دیکھو تو مُنہ صاف دہن صاف
چلتی تھی جو سن سن - یہ نکلتا تھا سخن صاف | ہوں میں تو وہ جاروب - کہ کر دیتی ہوں بن صاف

نااہل ہیں - نامرد ہیں - ناپاک ہیں اعدا
میں برقِ غضب ہوں خس و خاشاک ہیں اعدا

مغفر سے جھلم کاٹ کے گردن میں در آئی | گردن سے سرکتا تھا - کہ جوشن میں در آئی
جوشن سے گزرنا تھا - کہ بس تن میں در آئی | تن سے ابھی اُتری تھی - کہ توسن میں در آئی

بچتا کوئی کیا تیغِ قضا رنگ کے نیچے
اِک برقِ غضب کوند گئی تنگ کے نیچے

پیری کبھی - گہ خوں میں نہا کر نکل آئی | ٹھیری کبھی - غوطہ کبھی کھا کر نکل آئی
کاٹی جو زرہ - موج میں جا کر نکل آئی | منجدھار سے دو ہاتھ لگا کر نکل آئی

کیا ڈر اُسے طوفاں کا - جو چالاک ہو ایسا
جب باڑھ پہ دریا ہو - تو پیراک ہو ایسا

دم بھر نہ ٹھہرتی تھی - عجب طرح کا دم تھا | تیزی پہ جسے ناز تھا - سر اُس کا قلم تھا
ناگن میں نہ یہ زہر - نہ افعی میں یہ سم تھا | یہ فتح کی جویا تھی - قد اسواسطے خم تھا

یہ اصل تکبّر کے سخن کہتے ہیں اکثر
جو صاحبِ جوہر ہیں - جُھکے رہتے ہیں اکثر

(۲)

بجلی سی جو گر کر صفتِ گفتار سے نکلی | آواز بزنِ تیغ کی جھنکار سے نکلی

گہ ڈھال میں ڈوبی - کبھی تلوار سے نکلی در آئی جو پیکاں میں - تو سوفار سے نکلی

تھے بند خطا کاروں پہ در امن و اماں کے
چلّے بھی چھپے جاتے تھے گوشوں میں کماں کے

افلاک پہ چمکی کبھی - سر پر کبھی آئی کوندی کبھی جوشن پہ - سپر پر کبھی آئی
گہ پڑ گئی سینہ پہ - جگر پر کبھی آئی تڑپی کبھی پہلو پہ - کمر پر کبھی آئی

طے کر کے پھری - کونسا قصّہ تھا فرس کا؟
باقی تھا جو کچھ کاٹ - وہ حصّہ تھا فرس کا

بے پانؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی ندّی اُدھر اک خوں کی اُبلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی پی پی کے لہو - لعل اُگلتی ہوئی آئی

ہیرا تھا بدن رنگ زمرّد سے ہرا تھا
جوہر جو کہو! پیٹ جواہر سے بھرا تھا

سر ٹیکے - تو موج اُس کی روانی کو نہ پہنچے قلزم کا بھی دھارا ہو - تو پانی کو نہ پہنچے
بجلی کی تڑپ شعلہ فشانی کو نہ پہنچے خنجر کی زباں تیز زبانی کو نہ پہنچے

دوزخ کے زبانوں سے بھی آنچ اُسکی بُری تھی
برچھی تھی - کٹاری تھی - سروہی تھی - چُھری تھی

موجود بھی ہر غول میں اور سب سے جُدا بھی دم خم بھی - لگاوٹ بھی - صفائی بھی - ادا بھی
اِک گھاٹ پہ تھی آگ بھی - پانی بھی - ہوا بھی امرت بھی - ہلاہل بھی - مسیحا بھی - قضا بھی

کیا صاحب جوہر تھی - عجب ظرف تھا اُس کا
موقع تھا جہاں جس کا - وہیں صرف تھا اُس کا

ہر ڈھال کے پھولوں کو اڑاتا تھا پھل اس کا
ڈر جاتی تھی منہ دیکھ کے بزدل اجل اس کا
تھا لشکر باغی میں ازل سے عمل اس کا
تھا قلعۂ چار آئینہ گویا محل اس کا

اِس در سے گئی۔ کھول کے وہ در نکل آئی
گہہ صدر میں بیٹھی۔ کبھی باہر نکل آئی

نیزوں پہ گئی برچھیوں والوں کی طرف سے
پھر آئی سواروں کے رسالوں کی طرف سے
جا پہنچی کمانداروں پہ بھالوں کی طرف سے
منہ تیغوں کی جانب کیا ڈھالوں کی طرف سے

بس ہوگیا دفتر نظری نام و نسب کا
لاکھوں تھے تو کیا! دیکھ لیا جائزہ سب کا

پہنچی جو سپر تک۔ تو کلائی کو نہ چھوڑا
شوخی کو۔ شرارت کو۔ لڑائی کو نہ چھوڑا
ہر ہاتھ میں ثابت کسی گھائی کو نہ چھوڑا
تیزی کو۔ رکھائی کو۔ صفائی کو نہ چھوڑا

اَعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے
قینچی سی زباں چلتی تھی۔ فقرے تھے غضب کے

چار آئینہ والوں کو نہ تھا جنگ کا یارا
کہتے تھے زرہ پوش نہیں تاب خدارا
چو رنگ تھے سینے۔ تو کلیجہ تھا دوپارا
بچ جائیں تو جانیں کہ ملی جان دوبارا

جوشن کو سنا تھا۔ کہ حفاظت کا محل ہے
اِس کی نہ خبر تھی۔ کہ یہی دام اجل ہے

بدکیش لڑائی کا چلن بھول گئے تھے
سب حیلہ گری عہد شکن بھول گئے تھے
ناوک فگنی تیر فگن بھول گئے تھے
بیہوشی میں ترکش کے دہن بھول گئے تھے

معلوم نہ تھا جسم میں جاں ہے۔ کہ نہیں ہے
چلاّتے تھے قبضہ میں کماں ہے۔ کہ نہیں ہے

صفت اسپ

لکھتا ہے ادہم قلم اب سرعتِ عقاب
پستی میں سیل ہے۔ تو بلندی میں ہے سحاب
نعل اُس کے ماہِ نو ہیں۔ تو سُم رشکِ آفتاب
سُرعت میں برق۔ گرم روانی میں جوئے آب

اُڑنے میں اُس فرس کو پرندوں پہ اَوج ہے
اِک شور تھا۔ قدم نہیں دریا کی مَوج ہے

نازک مزاج۔ نسترن اندام۔ تیز رَو
اُس کا نہ اک قدم۔ نہ زغندیں ہرن کی سو
گردوں مسیر۔ بادیہ پیما و برق دو
دو روز سے نہ کاہ ملی تھی اُسے۔ نہ جَو

رفتار میں ہوا تھا۔ اشارے میں برق تھا
سُرعت میں کچھ کمی تھی۔ نہ چھل بل میں فرق تھا

صرصر سے تند۔ بو سے سبک رو۔ ہوا سے تیز
طاؤس و کبک و نسر و عقاب و ہما سے تیز
چالاک فہم و فکر سے۔ ذہنِ رسا سے تیز
جانے میں اُڑ کے ہدہدِ شہرِ سبا سے تیز

ذی جاہ تھا۔ سعید تھا۔ فیروز بخت تھا
رہوار کیا! ہوا پہ سلیماں کا تخت تھا

سمٹا۔ جما۔ اُڑا۔ اِدھر آیا۔ اُدھر گیا
تیروں سے اُڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا
چمکا۔ پھرا۔ جمال دکھایا۔ ٹھہر گیا
برہم کیا صفوں کو۔ پروں سے گزر گیا

گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اُس کی فگار تھا
ضربت تھی نعل کی۔ کہ سروہی کا وار تھا

(۲)

کوتاہ و گرد و صاف۔ کنوتی کمر کفل
کیا خوش نما کشادگئ سینہ و بغل!

سیماب کی طرح نہیں آرام ایک پل　　پھرتا تھا اِس طرح - کہ پھرے جس طرح سے کل
راکب نے سانس لی - کہ وہ کوسوں روانہ تھا
تارِ نفس بھی اُس کے لئے تازیانہ تھا

وہ جست وخیز و سُرعت و چالاکی سمند　　سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اُسکے جوڑ بند
سم قُرصِ ماہتاب سے رَوشن ہزار چند　　نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سربلند
گر ہِل گئی ہوا سے ذرا باگ - اُڑ گیا
پتلی سوار کی نہ پھری تھی - کہ مُڑ گیا

آہو کی جست - شیر کی آمد - پری کی چال　　کبکِ دری خجل - دلِ طاؤس پائمال
سبزہ سُبکروی میں قدم کے تلے نہال　　اِک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال
جو آگیا قدم کے تلے - گرد برد تھا
چھل بل غضب کے تھے - کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا - کبھی رہوار بن گیا　　آیا عرق - تو ابرِ گہر بار بن گیا
گہہ قطب - گاہ گنبدِ دوّار بن گیا　　نقطہ کبھی بنا - کبھی پرکار بن گیا
حیراں تھے اُس کے گشت پہ لوگ اُس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

ایک مثمن

از مؤلف

کیفیت قلعۂ اکبر آباد

یارب! یہ کسی مشعلِ کشتہ کا دھواں ہے
یا برہمیٔ بزم کی فریاد و فغاں ہے
ہاں دورِ گزشتہ کی مہابت کا نشاں ہے
یا گلشنِ برباد کی یہ فصلِ خزاں ہے
یا قافلۂ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
بانیٔ عمارت کا جلال اِس سے عیاں ہے
اُڑتا تھا یہاں پرچمِ جم جاہیٔ اکبر
بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہیٔ اکبر

باہر سے نظر ڈالئے اِس قلعہ پہ یک چند
گویا کہ ہے اِک سورما مضبوط۔ تنومند
کیا بارۂ سنگین کا پہنا ہے قزآگند!
برپا ہے لبِ آبِ جمن صورتِ الوند
یا ہند کا رجپوت ہے۔ یا تُرکِ سمرقند
ریتی کا قزآگند پہ باندھا ہے کمر بند
مسدود ہے خندق سے رہِ فتنہ و آشوب
اربابِ تمرّد کے لئے برج ہیں سرکوب

تعمیرِ درِ قلعہ بھی البتّہ ہے موزوں
کی ہے شُعرانے صفتِ طاقِ فریدوں
گو ہمسرِ کیواں ہے۔ نہ ہم پایۂ گردوں
پُر شوکت وذی شان ہے اُس کا رُخِ بیروں
معلوم نہیں اُس سے وہ نکتہ تھا کہ افزوں
محراب کی ہیئت سے ٹپکتا ہے یہ مضموں
پیلانِ گراں سلسلہ با ہودجِ زرّیں

اِس در سے گزرتے تھے بصد رونق و تزئیں

اکبر سا کبھی مخزنِ تدبیر یہاں تھا
یا شاہجہاں مرجعِ توقیر یہاں تھا
القصہ۔ کبھی عالمِ تصویر یہاں تھا
یا طنطنۂ دورِ جہانگیر یہاں تھا
یا مجمعِ ذی رتبہ مشاہیر یہاں تھا
دنیا سے سوا جلوۂ تقدیر یہاں تھا

بہتا تھا اسی کاخ میں دولت کا سمندر
تھے جشنِ ملوکانہ اِسی قصر کے اندر

وہ قصرِ مُعلّی کہ جہاں عام تھا دربار
وہ سقفِ زراندود ہے مانندِ چمن زار
اب بانگِ نقیب اُس میں۔ نہ چاؤش کی للکار
آئینہ نمط صاف ہیں جس کے در و دیوار
وہ فرش ہے مرمر کا مگر چشمۂ انوار
سرہنگِ کمربستہ۔ نہ وہ مجمعِ حُضّار

کہتا ہے کبھی مرکزِ اقبال تھا میں بھی
ہاں! قبلہ گہِ عظمت و اجلال تھا میں بھی

جب تک کہ مشیّت کو مرا وقر تھا منظور
شاہانِ مُعاصر کا مُعیّن تھا یہ دستور
تا میری زیارت سے کریں چشم کو پُر نور
نافذ تھا زمانہ میں مری جاہ کا منشور
کرتے تھے سفیرانِ ذوی القدر کو مامور
آوازہ مری شان کا پُہنچا تھا بہت دور

اکنافِ جہاں میں تھا مرا دبدبہ طاری
تسلیم کو جھکتے تھے یہاں ہفت ہزاری

وہ چتر۔ وہ دیہیم۔ وہ سامان کہاں ہیں؟
وہ بخشی و دستور۔ وہ دیوان کہاں ہیں؟
وہ دولتِ مغلیہ کے ارکان کہاں ہیں؟
وہ شاہ۔ وہ نوئین۔ وہ خاقان کہاں ہیں؟
خدامِ ادب اور وہ دربان کہاں ہیں؟
فیضی و ابوالفضل سے اعیان کہاں ہیں؟

سنسان ہے وہ شاہ نشیں آج صد افسوس
ہوتے تھے جہاں خان و خوانین زمیں بوس

وہ بارگہِ خاص کی پاکیزہ عمارت
بڑھتی تھی جہاں نظم و سیاست کی مہارت
جوں شحنۂ معزول پڑی ہے وہ اکارت

تاباں تھے جہاں نیّرِ شاہی و وزارت
آتی تھی جہاں فتحِ ممالک کی بشارت
سیّاح کیا کرتے ہیں اب اُس کی زیارت

کہتا ہے سخن فہم سے یوں کتبہ دروں کا
"تھا مخزنِ اسرار یہی تاجوروں کا"

اورنگِ سیہ رنگ جو قائم ہے لبِ بام
اشعار میں ثبت اُس پہ جہانگیر کا ہے نام
پر صاف نظر آتا ہے کچھ اور ہی انجام

بوسہ جسے دیتا تھا ہر اک زبدۂ عظّام
شاعر کا قلم اُس کی بقا لکھتا ہے مادام
سالم نہیں چھوڑے گی اسے گردشِ ایام

فرسودگئ دہر نے شق اب تو کیا ہے
آیندہ کی نسلوں کو سبق خوب دیا ہے

ہاں کس لئے خاموش ہے۔ او تختِ جگر ریش؟
کملی ہے تری دوش پہ کیوں صورتِ درویش؟
بولا۔ کہ زمانہ نے دیا نوش۔ کبھی نیش

کس غم میں سیہ پوش ہے۔ کیا سوگ ہے درپیش؟
جوگی ہے ترا پنتھ۔ کہ صوفی ہے ترا کیش؟
صدیاں مجھے گزری ہیں یہاں تین کم و بیش

صدقے کبھی مجھ پر گہر و لعل ہوئے تھے
شاہانِ معظم کے قدم میں نے چھوئے تھے

رنگیں محل اور بُرجِ مثمّن کا وہ انداز
یاں مطربِ خوش لہجہ کی تھی گونجتی آواز

صنعت میں ہے بے مثل تو رفعت میں سرافراز
گہ ہند کی دُھرپت تھی۔ کبھی نغمۂ شیراز

اب کون ہے؟ بتلائے جو کیفیتِ آغاز
زنہار! کوئی جاہ و حشم پر نہ کرے ناز

جن تاروں کے پرتو سے تھا یہ بُرج منوّر
اب اُن کا مقابر میں تہِ خاک ہے بستر

اُس عہد کا باقی کوئی ساماں ہے۔ نہ اسباب
وہ جامِ بلوریں ہیں۔ نہ وہ گوہرِ نایاب
ہنگامہ جو گزرا ہے۔ سو افسانہ تھا یا خواب
فوّارے شکستہ ہیں۔ تو سب حوض ہیں بے آب
وہ چلمنِ زرتار۔ نہ وہ بسترِ کمخواب
یہ معرضِ خُدّام تھا۔ وہ موقفِ حُجّاب

وہ بزم۔ نہ وہ دَور۔ نہ وہ جام۔ نہ ساقی
ہاں! طاق و رواق اور در و بام ہیں باقی

مستورِ سراپردۂ عصمت میں تھے جو گُل
کچھ خیریِ فرغانہ تھے۔ کچھ لالۂ کابل
تعمیر کے انداز کو دیکھو بہ تامّل
سو دودۂ ترک اور مغل ہی سے نہ تھے کُل
پھر مولسریِ ہند کی اُن میں گئی رل جُل
تاتاری و ہندی ہے بہم شان و تجمّل

سیّاحِ جہاندیدہ کے نزدیک یہ تعمیر
اکبر کے خیالاتِ مرکّب کی ہے تصویر

درشن کے جھروکے کی پڑی تھی یہیں بنیاد
زنجیرِ عدالت بھی ہوئی تھی یہیں ایجاد
وہ نورجہاں اور جہانگیر کی اُفتاد
ہوتی تھی تولادان میں کیا کیا دہش و داد
جو سمعِ شہنشاہ میں پہنچاتی تھی فریاد
اس کاخِ ہمایوں کو بہ تفصیل ہے سب یاد

ہر چند کہ بیکار یہ تعمیر پڑی ہے
قدر اس کی مورخ کی نگاہوں میں بڑی ہے

اب دیکھئے وہ مسجد و حمّام زنانہ
وہ نہر۔ وہ حوض۔ اور وہ پانی کا خزانہ

صنعت میں ہر اک چیز ہے یکتا و یگانہ
کیا ہوگئے وہ لوگ! کہاں ہے وہ زمانہ!
ہے طرزِ عمارت سے عیاں شانِ شہانہ
ہر سنگ کے لب پر ہے غم اندوز ترانہ

چغتائیہ گلزار کی یہ فصلِ خزاں ہے
مُمتاز محل ہے نہ یہاں نور جہاں ہے

وہ قصر جہاں جودھ پوری رہتی تھی بائی
دیکھا اُسے جاکر۔ تو بُری گت نظر آئی
گویا در و دیوار یہ دیتے ہیں دُہائی
تھی دولت و ثروت نے جہاں دھوم مچائی
صحنوں میں جمی گھاس۔ تو دیواروں پہ کائی
ممکن نہیں طوفانِ حوادث سے رہائی

جس گھر میں تھے نسرین و سمن یا گُل و لالہ
اب نسلِ ابابیل میں ہے اُس کا قبالہ

وہ مسجدِ زیبا۔ کہ ہے اس بزم کی دُلہن
محراب و در و بام ہیں سب نور کا مسکن
کافور کا تودہ ہے۔ کہ الماس کا معدن
خوبی میں یگانہ ہے۔ ولے سادہ و پُرفن
موتی سے ہیں دالان۔ تو ہے دودسا آنگن
یا فجر کا مطلع ہے۔ کہ خود روز ہے روشن

بلّور کا ہے قاعدہ یا نور کا ہے راس
باطل سی ہوئی جاتی ہے یاں قوّتِ احساس

ہاتھوں نے ہنرمند کے اک سحر کیا ہے
یا تارِ نظر سے کہیں پتھر کو سیا ہے
نے شمع۔ نہ فانوس۔ نہ بتی۔ نہ دیا ہے
سانچے میں عمارت کو مگر ڈھال دیا ہے
مرمر میں مہ و مہر کا سا نور و ضیا ہے
ہاں چشمۂ خورشید سے آب اس نے پیا ہے

چلئے جو یہاں سے تو نظر کہتی ہے فی الفور
نظارہ کی دو مجکو اجازت کوئی دم اَور

مسجد نے اشارہ کیا پتھر کی زبانی
کچھ شوکتِ ماضی کی کہی اس نے کہانی
"ان حجروں میں ہے شمع۔ نہ اس حوض میں پانی
اس قلعہ میں ہوں شاہجہاں کی ہیں نشانی
کچھ حالتِ موجودہ بایں سحر بیانی
فواروں کے دل میں بھی ہے اک دردِ نہانی

تسبیح۔ نہ تہلیل۔ نہ تکبیر و اذاں ہے
بس گوشۂ تنہائی ہے اور قفلِ گراں ہے"

جمگھٹ تھا کبھی یاں وزرا و امرا کا
چرچا تھا شب و روز یہاں ذکرِ خدا کا
اک قافلہ ٹھیرا تھا یہاں عزّ و علا کا
مجمع تھا کبھی یاں صلحا و علما کا
ہوتا تھا ادا خطبہ سدا حمد و ثنا کا
جو کچھ تھا گزر جانے میں جھونکا تھا ہوا کا

ہیں اب تو نمازی مرے باقی یہی دو تین
یا دھوپ ہے یا چاندنی یا سایۂ مسکیں

وہ دور ہے باقی نہ وہ ایّام و لیالی
ہر کوشک و ایواں۔ ہر اک منزلِ عالی
آقا نہ خداوند۔ اہالی۔ نہ موالی
جو واقعہ ہستی تھا سو ہے آج خیالی
عبرت سے ہے پُر اور مکینوں سے ہے خالی
جز ذاتِ خدا کوئی نہ وارث ہے۔ نہ والی

یہ جملہ محلّات۔ جو سنسان پڑے ہیں
پتھر کا کلیجہ کئے حیران کھڑے ہیں

جب کُند ہوئی دولتِ مغلیہ کی تلوار
تب لیک جو تھا لشکرِ انگلش کا سپہدار
یہ بارہ و برج اور یہ ایوان۔ یہ دیوار
اور لوٹ لیا جاٹ نے ایوانِ طلا کار
افواجِ مخالف سے ہوا برسرِ پیکار
کچھ ٹوٹ گئے ضرب سے لوگوں کی بہ ناچار

ہے گردشِ ایّام کے حملوں کی کسے تاب

پھر قلعۂ اکبر ہی میں تھا کیا پرِ سُرخاب!

آخر کو مخالف کی شکستہ ہوئی قوت — اونچا ہوا سرکار کے اقبال کا رایت
لہرانے لگا پھر علمِ امن و حفاظت — آثار قدیمہ کی لگی ہونے مرمّت
یہ بات نہ ہوتی۔ تو پہنچتی وہی نوبت — دیوار گری آج۔ تو گل بیٹھ گئی چھت

حکّامِ زماں کی جو نہ ہوتی نگرانی
رہ سکتی نہ محفوظ یہ مغلیہ نشانی

اربابِ خرد چشمِ بصیرت سے کریں غور — اکبر کی بنا اس سے بھی پایندہ ہے اِک اَور
سردی کی جفا جس پہ نہ گرمی کا چلے جَور — ہر چند گزر جائیں بہت قرن۔ بہت دور
برسوں یونہیں پھرتے رہیں برجِ حمل و ثور — اُس میں نہ خلل آئے کسی نوع۔ کسی طور

انجینیروں کی بھی مرمّت سے بری ہے
وہ حصنِ حصیں کیا ہے فقط ناموری ہے

او اکبرِ ذیجاہ! تری عزّت و تمکیں — محتاجِ مرمّت ہے۔ نہ مستلزمِ تزئیں
کندہ ہیں دلوں میں تری اُلفت کے فرامیں — ہے تیری محبّت کی بنا اک دژِ روئیں
گو حملۂ بے سود کرے بھی کوئی کم بیں — زائل نہیں ہونے کی ترے عہد کی تحسیں

پشتوں سے رعایا میں بہ آئینِ وراثت
قائم چلی آتی ہے ترے نام کی عظمت

بکرم کی سبھا کو تری صحبت نے بھلایا — اور بھوج کا دورہ تری شہرت نے بھلایا
ارجن کو تری جُرأت و ہمّت نے بھلایا — کسریٰ کو ترے دَورِ عدالت نے بھلایا
اسکندر و جم کو تری شوکت نے بھلایا — پچھلوں کو۔ غرض تیری عنایت نے بھلایا

آتے ہیں زیارت کو تو اب تک ہے یہ معمول
زائر تری تُربت پہ چڑھا جاتے ہیں دو پھول

ہو کُہنہ و فرسودہ ترا قلعہ تو کیا غم
بھرتا ہے ہر اک فرقہ محبّت کا ترے دم
رتبہ ہے ترا ہند کے شاہوں میں مسلّم

شہرت ہے ترے نام کی سو قلعوں سے مُحکم
لکھتے ہیں مورّخ بھی تجھے اکبرِ اعظم
یہ فخر ترے واسطے زنہار نہیں کم

گو خاک میں مل جائے ترے عہد کی تعمیر
ہے کتبۂ عزّت ترا ہر سینہ میں تحریر

رباعیات

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱)

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال — مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی — اندیشۂ فوت ہو۔ نہ ہو خوفِ زوال

(۲)

موجود ہنر ہوں ذات میں جس کی ہزار — بدظن نہ ہو۔ عیب اُس میں اگر ہوں دو چار
طاؤس کے پاے زشت پر کرکے نظر — کر حُسن و جمال کا نہ اُس کے اِنکار

(۳)

ہیں یار رفیق۔ پر مصیبت میں نہیں — ساتھی ہیں عزیز۔ لیک ذلّت میں نہیں
اُس بات کی انساں سے توقع ہے عبث — جو نوعِ بشر کی خود جبلّت میں نہیں

(۴)

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر — آتا نہیں فرق اس کے سوا اُن میں نظر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا — جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

از مؤلف

(۱)

تیزی نہیں منجملۂ اوصافِ کمال — کچھ عیب نہیں۔ اگر چلو دھیمی چال
خرگوش سے لے گیا ہے کچھوا بازی — ہاں! راہِ طلب میں شرط ہے استقلال

(۲)

گرنیک دلی سے کچھ بھلائی کی ہے — یا بدمنشی سے کچھ بُرائی کی ہے
اپنے ہی لئے ہے سب نہ اَوروں کے لئے — اپنے ہاتھوں نے جو کمائی کی ہے

(۳)

دین اور دنیا کا تفرقہ ہے مہمل — نیت ہی یہ موقوف ہے تنقیح عمل
دنیا داری بھی عینِ دین داری ہے — مرکوز ہو گر رضائے حق عزّ و جل

(۴)

دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا ہرگز — ڈھونڈا۔ تو کہیں پتا نہ پایا ہرگز
کھونا پانا ہے سب فضولی اپنی — یہ خبط نہ ہو مجھے خدایا ہرگز

امیر مینائیؒ

(۱)

گھر کھُدنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے — روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے
یا ہم جاتے تھے گھر سے رخصت ہو کر — یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

(۲)

بالفرض حیات جاودانی تم ہو — بالفرض۔ کہ آبِ زندگانی تم ہو
ہم سے نہ ملو۔ تو خاک سمجھیں تم کو — لیں نام نہ پیاس کا۔ جو پانی تم ہو

غالب

(۱)

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے — تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ ہے صفر۔ کہ افزائشِ اعداد کرے

(۲)

اِن سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے؟ بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گِن کر دیوینگے ہم دعائیں سو بار فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

میر انیس

(۱)

پُرساں کوئی کب جوہرِ ذاتی کا ہے ہر گُل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

(۲)

جو شے ہے فنا اُسے بقا سمجھا ہے جو چیز ہے کم اُسے سوا سمجھا ہے
ہے بحرِ جہاں میں عمر مانندِ حباب غافل! اِس زندگی کو کیا سمجھا ہے؟

(۳)

ہُشیار! کہ وقت ساز و برگ آیا ہے ہنگامِ یخ و برف و تگرگ آیا ہے
محتاجِ عصا ہوئے تو پیری نے کہا چلیئے۔ اب چوبدارِ مرگ آیا ہے

(۴)

گلشن میں پھروں۔ کہ سیرِ صحرا دیکھوں یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے حیراں ہوں۔ کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں!

(۵)

انسان ہی کچھ اس دور میں پامال نہیں سچ ہے کوئی آسودہ و خوش حال نہیں

اندیشۂ آشیان و خوف صیّاد	مُرغانِ چمن بھی فارغ البال نہیں

(۶)

ہر طرح ت یہ سرائے فانی دیکھی	ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بُڑھاپا دیکھا	جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

میر تقی

(۱)

ہم میر سے کہتے ہیں- نہ تو رویا کر	ہنس کھیل کے ٹک چین سے بھی سویا کر
پایا نہیں جانے کا وہ دُرِّ نایاب	کڑھ کڑھ کے عبث جان کو مت کھویا کر

(۲)

راضی ٹک آپ کو رضا پر رکھئے	مائل دلِ تنگ کو قضا پر رکھئے
بندوں سے تو کچھ کام نہ نکلا اے میر	سب کچھ موقوف اب خدا پر رکھئے

(۳)

ملئے اُس شخص سے جو آدم ہووے	ناز اُس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرمِ سخن تو گرد آوے اِک خلق	خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

تمت

تمام شد حصۂ نظم